شمارہ چہارم

نسٹیئن

۲۰۱۴

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

نسٹیئن

۲۰۱۴

جلد: ۴

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

انجینئر محمد اصغر
ریکٹر

مجلِس مشاورت

انجینئر محمد شاہد
پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا
پرو ریکٹر

محمود بشیر باجوہ
ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر:
احسان الحق
ڈپٹی ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر طلباء:
محمد عثمان اختر، اویس عزیز

ترتیب وتزئین: ندیم شہزاد

طابع: **نسٹ پریس**

ناشر: **سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ**

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد

ترتیب

اداریہ		6
اخلاقیات		
زندگی مشکل نہیں	جی سی اسامہ بن ثناء، ایم سی ایس	7
آج کا مسلمان	این سی میمونہ طاہرہ، ایم سی ایس	8
یادش بخیر	اسلم بزمی	9
فلکیات	ماخوذ من خطبات از ڈاکٹر ذاکر نائیک	12
زاہد کون ہے؟	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	13
سچی محبت	محمد ایوب، ایس سی ایم ای	14
پاکستانیات		
معجزاتی مملکت	تحریر: محمد عبدالرحمٰن	15
پہلی پاکستانی خاتون کوہ پیما	جی سی اسامہ بن ثناء، ایم سی ایس	19
ھمالہ	علامہ اقبالؒ	20
مضامین		
کوچہء خیام کا ایک نابغہء روزگار فقیر	تحقیق و تالیف پیر اکرم	21
ویڈیو گیمز بارآور کیوں؟	عمر فاروق، فیکلٹی ممبر، ایم سی ایس	30
بنام رنگِ بے رنگ	سعدیہ خاف، SEECS	31
حضرت عثمان بن عفانؓ	حامد بلال	32
غرناطہ میں چند روز	ڈاکٹر محمد حنیف، ایم سی ایس	34
عہد قدیم کے چند بڑے کتب خانے	ارشاد احمد، ایم سی ایس	36
بیک بینچرز	این سی خرم عظیم ملک، ایم سی ایس	39
بیٹھک سسٹم اور جدید سماج	این سی حسن ثنیٰ جعفری، ایم سی ایس	40
کِر چی کِر چی دِل	ادیبہ رحمٰن، S^3H	42
مزاح		
میموں کے کتے ''دوست''	مصنف: نصیرالدین گوہر	45
ہاسٹل بیتیاں	کمال مصطفیٰ، نسٹ سینٹر فار انرجی سسٹمز	50
سی این جی کی قطار	عبدالجبار خان، فیکلٹی سپانسر، بزم پاکستان	52
مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا	نمرہ شکیل، کالج آف الیکٹریکل اینڈ ملینیکل انجینئرنگ	54
مسکرایئے		56

غزلیات

پروفیسر اصغر قادر، محمد عثمان اختر (NICE)، اسامہ وقار بھٹی (SEECS)، کرنل محمد آصف اقبال (EME College) 57
صاحبزادہ عزیر اللہ (NICE)، ادیبہ رحمٰن (S^3H) سیّد شوزیب عباس SEECS

افسانے

دوست	اویس عزیز، ایس ایم ایم ای	61
ادھوری خواہش	بزمِ ادب، ای ایم ای	63
آفاق	محمد عثمان اختر، این آئی سی ای	67
دِل کی بات	اسد طارق، SEECS	70
پُراسرار محبت	اویس عزیز، ایس ایم ایم ای	79
شناخت کا سفر	ابراہیم علی خان، ایم سی ایس	81
تکمیل	این سی احتشام قاضی، ایم سی ایس	83
شناخت	جی سی سعد احمد، ایم سی ایس	85

منظومات

نظم	محمد عثمان اختر، این آئی سی ای	87
... پھر کیسے بھلا سر کو اُٹھا کر چلے کوئی	محمد اعزاز تنویر، این بی ایس	88
ماں	حسان عبداللہ، ایم بی بی ایس	89
تم سے بچھڑے تو احساس ہوا ہے ہم کو	سعدیہ خاف، SEECS	90
نظم	محمد حفیظ اللہ، این آئی سی ای	92
حکایت	محمد عثمان اختر، این آئی سی ای	93
جہانِ بے مروتی	باصرہ نور، ایم سی ایس	95
جُدا ساتھی	پروفیسر اصغر قادر	95
نظم	ادیبہ رحمٰن، S^3H	96
وجدِ شَوق	اسامہ وقار بھٹی، SEECS	96

قندِ مُکّرر

انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	نسرین کوثر	97
روحِ قائدؒ سے مکالمہ	ممتاز اقبال ملک	100
انتخاب		109
مشاعرہ آن لائن	قندیل رحمٰن	114
پہچان	فرح اسلم	117

ہمارے ادارے

College of E&ME	کالج آف الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ
MCE	ملٹری کالج آف انجینئرنگ
MCS	ملٹری کالج آف سگنلز
PNEC	پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج
AM College	آرمی میڈیکل کالج
CAE	کالج آف ایرونا ٹیکل انجینئرنگ
SCEE	سکول آف سِول اینڈ انوائرمنٹل انجینئرنگ
SEECS	سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس
SCME	سکول آف کیمیکل اینڈ مٹیریلز انجینئرنگ
SMME	سکول آف میکینکل اینڈ مینوفیکچرنگ انجینئرنگ
NBS	نَسٹ بزنس سکول
ASAB	عطاء الرحمان سکول آف اپلائیڈ بائیوسائنسز
RCMS	ریسرچ سینٹر فار ماڈلنگ اینڈ سیمولیشن
SNS	سکول آف نیچرل سائنسز
NIPCONS	نسٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کانفلکٹ سٹڈیز
SADA	سکول آف آرٹ، ڈیزائن اینڈ آرکی ٹیکچر
CES	سینٹر فار انرجی سسٹم
CIPS	سینٹر فار انٹرنیشنل پیس اینڈ سٹیبلٹی
S^3H	سکول آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز
NP	نسٹ پبلشنگ
RCWTTI	ریجنل سینٹر فار واٹر ٹیکنالوجی اینڈ ٹرانس باؤنڈری ایشوز

اداریہ

عمومی طور پر سائنس اور ادب کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا ہمارے معمول سے باہر کی شے ہے اور ہمارے ہاں اگر ان دو کا نام ساتھ ساتھ لیا جائے تو عوام انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ یہ اُن عوام کا ذکر ہے جنہوں نے سائنس کو ادب سے الگ سمجھ رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ سائنس تک ادب کی رسائی ناممکن ہے۔ یہاں مجھے اچانک عمر خیام کا خیال آیا ہے جس کی رباعیات اور ریاضی میں خدمات بیک وقت یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ کیا اُس انسان کا دماغ ہم سب سے مختلف تھا جس نے دو متضاد راہوں میں اسے خرچ کیا؟ بالکل نہیں! وہ بھی ہم جیسا انسان تھا جس نے ادب اور سائنس کو ایک نقطے پر لا کھڑا کیا۔ اُس کے لئے یہ دونوں اشیاء مختلف نہیں تھیں اور ہونی بھی نہیں چاہئیں۔ اردو زبان پڑھنے والے ایک عام شخص کے لیے تو ادب اور سائنس کا ربط اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ سائنس کو تب ہی سمجھنے کے لائق ہوگا' جب اسے کسی بھی زبان (ہمارے معاشرے کے لئے اردو) پر عبور حاصل ہو۔

''دنسٹیئن'' نے سائنس اور ادب کو یکجا کر کے نہ صرف اس کی نفی کر دی' بلکہ دونوں کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کسی ماہرِ فن اور فن اور ادب کو اگر فن کے زمرے میں ہی ڈال دیا جائے تو 'دنسٹیئن' کسی 'گنجِ گراں مایہ' سے کم نہیں۔ اس میں ملک و ملّت سے عقیدت کا اظہار نظر آتا ہے اور سائنس کے میدان میں ادب کی دوڑ کا احاطہ بھی با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں مغربی رنگ کی تحریریں نظر آتی ہیں' وہیں مشرقی نقش و نگار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا سامان بھی موجود ہے۔ شعر و ادب کے حوالے سے بھی نسٹیئن نے اپنا مقام فرومایہ نہیں ہونے دیا۔ انتخابِ اشعار اور منظومات کے سلسلے نے اس کو نئی جلا بخشی ہے۔

سائنس اور اردو ادب کا تعلق نسٹیئن نے اور بھی راسخ کر دیا ہے کہ اردو ادب سے شغف رکھنے والا ایک عام انسان سائنس کے مضامین سے فیض یاب ہو سکتا ہے' جان سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے سائنس کو کس مقام تک پروان چڑھایا اور آنے والا معاشرہ کن طلسماتی اجزاء سے مزّین ہوگا۔ یہاں علامہ اقبالؒ کا وہ شعر تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے تقریباً ایک صدی قبل آج ہی کے زمانے کی تصویر دکھا دی تھی:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس شعر کے ضمن میں عرض ہے کہ اگر آج کے زمانے کی توضیح صرف دو مصرعوں میں اس خوبصورتی اور اختصار سے ہو سکتی ہے' تو نثر کا ہر حرف اہلِ علم کے نزدیک موتی کی مانند ہے۔ سائنس اور ادب کا گہرا تعلق ہمیں ہر دور میں نمایاں نظر آتا ہے اور کوئی قوم ان دو کے رابطے کے بغیر چل نہیں سکتی۔

سائنس کی الگ جگہ ہے اور ادب کی الگ' مگر ان کا رابطہ اور ملاپ ہمیں ایک نئے جہان سے روشناس کراتا ہے اور 'دنسٹیئن' اس جہان کی ایک شاہراہ ہے۔

میں مشکور ہوں طالب علم مدیر محمد عثمان اختر کا جنہوں نے ''دی نسٹیئن 2014'' کی اصلاح کرنے میں میری بھرپور اعانت کی۔ عثمان ایک باصلاحیت طالب علم' عمدہ شاعر اور لکھاری ہے۔ اللہ پاک اُسے کامیاب فرمائے۔ اس شمارے میں قندِ مُکّرر کے نام سے ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں نسٹیئن کی سابقہ اشاعتوں میں چھپنے والی منتخب تحریروں کو نئے طلباء اور قارئین کے لئے دوبارہ شائع کیا گیا ہے تاکہ وہ اس گنجِ گراں مایہ سے مستفید ہو سکیں۔ میں انتہائی ممنون ہوں ممتاز اقبال ملک کا جنہوں نے مسوّدے کو بغور پڑھا اور نہایت قیمتی مشوروں سے نوازا اور اس ادبی مجلّہ کو قابلِ اشاعت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اللہ پاک ملک صاحب کو صحت' ایمان اور توانائی عطاء فرمائے۔ آمین

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اپنی آراء سے آگاہ فرما کر ''دی نسٹیئن'' کو بہتر بنانے میں ہماری معاونت فرمائیں۔

مدیر

جی سی اسامہ بن ثناء : ایم سی ایس

زندگی مشکل نہیں

بحیثیتِ مسلمان اگر ہم اپنی زندگی کا تجزیہ کریں تو سب سے بڑی خوش قسمتی کا احساس یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اسلامی گھرانے اور اسلامی معاشرے میں پیدا کیا ہے مگر سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم اسلام سے دور ہیں۔ اگر معاشرے پر نظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہر شخص صبح سے شام تک اس تگ و دو میں لگا ہوا ہے کہ وہ اپنے لیے دنیا کی ہر ممکنہ آسائش پیدا کر لے جس کا مقصد زندگی میں سکون کا حصول ہے مگر ہم یہ بھول گئے ہیں کہ سکون دنیاوی چیزوں میں نہیں اور نہ ہی عالیشان گھروں میں رہنے اور بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنے پھرنے سے ملتا ہے۔

دراصل ہم اپنے خوبصورت دین اسلام کے پیغامات سے نا آشنا ہوئے پھر رہے ہیں۔ اور یہ بھول گئے ہیں کہ سکون اور اطمینانِ قلب تو اللہ کی یاد سے ہی ملتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ:

''اَلَا بِذِکرِ اللّٰہِ تَطمَئِنُّ القُلُوبُ''۔

(ترجمہ: اور دلوں کا سکون اللہ کے ذکر ہی میں ہے)

ہم اس بات کا اقرار تو کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور اسوۂ حسنہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے مگر ہم اسے اپنی زندگی میں عملی جامہ نہیں پہناتے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر شخص پریشان ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر، طالب علم ہو یا استاذ، بے روزگار ہو یا اچھی نوکری والا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے اور ہماری زندگیوں میں پریشانیاں، آلام و مصائب، بددیانتی اور مشکلات عام ہوگئی ہیں اور ایسے میں ہر ذی روح کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرتا ہے کہ ''ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟'' جواب یہی ہے کہ ہم قرآن پاک اور سنت کو اپنانے کی بجائے اپنے نفس کے تابع ہو چکے ہیں۔

قرآنی تعلیمات ہمیں ہر حال میں اچھے طریقے سے رہنا سکھاتی ہیں۔ اور ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ آزمائشیں صرف دین پہ چلنے سے نہیں آتیں بلکہ جو آزمائشیں اور مصائب ہمارے لیے لکھ دیے گئے ہیں وہ تو ہمیں مل کر ہی رہیں گے، قرآن وسنت سے دوری ہمیں مصائب میں مبتلا کر کے پاگل کر دیں گے اور قرآن کا قرب ہمیں مشکلات سے نکلنے کا راستہ دکھاتا ہے۔

اگر ہم صادق اور صاف دل کے ساتھ قرآن پڑھیں، نیتیں صاف رکھیں، سچ بولیں، امانتوں میں خیانت نہ کریں، دوسروں کے راز رکھنا سیکھیں، لوگوں کو معاف کریں، رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئیں، صبر کریں اور اس کا بدلہ اگلے جہان میں مانگیں کیونکہ دنیا بدلے کی جگہ نہیں ہے تو نہ صرف ہماری زندگیاں بابرکت اور پرسکون ہو جائیں گی بلکہ ہماری آخرت بھی سنور جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کسی بھی شخص کو اس وقت تک ہدایت نہیں دیتے جب تک وہ خود ہدایت کی طلب نہ کرے۔

این سی میمونہ طاھرہ : ایم سی ایس

آج کا مسلمان

آج کل کے مسلمانوں کو اکثر اوقات ایک بہت بڑے المیے کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک طرف جہاں مغرب کی طرف سے اسلام کے عقائد اور اصولوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہاں مسلمان معاشرے کے اندر بھی اسلام کے بارے میں شکوک اور ابہام وجود رکھتے ہیں۔ خصوصاً سوشل میڈیا اور ذرائع ابلاغ استعمال کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت کو تقریباً روزانہ ہی اس صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس کا حل ایک طرف تو یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام کے نظریات کو صحیح روشنی میں اعتدال کے ساتھ تعصب کی عینک چڑھائے ہوئے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسری طرف کچھ جذباتی مسلمان جلد ہی غصے میں آ کر اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں یہ ایک فطری سی بات ہے کہ بے بسی محسوس کرنے والے انسان کو غصہ ہی آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام کی جو تعلیمات ہمیں دی گئی ہیں ان میں واقعتاً کوئی خامی ہے یا زمانے کے تغیرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اصل وجہ جس سے ایک فتنہ دبتا ہے اور مسلمان ابھی ایک سکھ کا سانس نہیں لیتے کہ پھر انگشت نمائی شروع ہو جاتی ہے' یہ ہے کہ مسلمانوں کے قول و فعل میں شدید تضاد ہے ان واقعات میں سے اکثر کا تعلق اسلامی قوانین' عورتوں کی آزادی' بنیادی حقوق اور اسلامی معاشرے میں موجود غربت اور جہالت سے ہوتا ہے مسلمان لاکھ چیخ چیخ کر کہیں کہ اسلامی قوانین فطرت کے عین مطابق ہیں عورتوں کو اسلامی معاشرے میں بھرپور عزت حاصل ہے اور تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت ہے مگر جب تک عملی طور پر نقشہ اس کے بالکل برعکس ہو تو کوئی فائدہ نہیں ان اعتراضات کے ساتھ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عقائدِ اسلام پر کئے جانے والے حملوں کا کوئی مدلّل جواب دے بھی دے اور مسلمان فرطِ جذبات میں احتجاج بھی کریں جب تک باقی معاملات میں اس جذبے کی کوئی جھلک نہ ہو' یہ بحث اور حملے ختم ہوتے نظر نہیں آتے۔

جہاں ایک طرف قرآن میں واضح حکم ہے کہ ہم فرقوں میں تقسیم نہ ہوں اور اللہ کی کتاب اور سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اس کے باوجود مسلمانوں کے اندرونی فسادات میں مسلمانوں کا جتنا خون بہتا ہے وہ خود اپنی جگہ باعث عبرت ہے اسلام عفو و درگزر' ہمدردی اور ایثار سکھاتا ہے جبکہ ہمارے دل اپنے ہی بھائیوں کے خلاف نفرت اور بغض سے بھرے ہوئے ہیں اور ہم کسی کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی معاف کرنے کو بھی تیار نہیں ایک طرف ہم اپنے خاندانی اور معاشرتی نظام پر فخر کرتے ہیں جو اسلام نے ہمیں عطا کیا مگر دوسری طرف اسی کے مطابق عورتوں کو عزت دینے میں ناکام ہیں جتنا زور دیانت داری' انصاف اور احسان پر دیا گیا ہے اس سے بھی زیادہ خیانت' دھوکہ دہی' ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ اگر کوئی بھی شخص اسلام کے نظام سے متاثر ہو کر اسلامی معاشرے کا رخ کرے تو وہ نہ صرف مسلمانوں سے بدظن ہو گا بلکہ اسلام سے بھی دل برداشتہ ہو جائے گا ایسے میں قصور سراسر مسلمانوں کا ہے۔

اسلم بزمی

یادش بخیر

۲۱ اکتوبر ۲۰۱۴ کی صبح میں حسب معمول سرکاری کوچ میں نسٹ یونیورسٹی کی جانب رواں تھا۔ یہ کوئی ساڑھے ۸ بجے کا عمل ہوگا۔ شاہراہ کشمیر پر پہنچنے سے قبل اچانک میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب محمود الحق علوی صاحب کی صاحبزادی رافیلہ ناز رندھی ہوئی آواز میں بول رہی تھیں "سر شاید آپ کو معلوم نہیں۔ ابو فوت ہوگئے" تشفی کے میرے تمام الفاظ بے سود ہوگئے۔ شدت غم سے رافیلہ روئے جارہی تھی۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا اور بے اختیار رو پڑا۔ اس کے بعد ان گنت یادوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

؎ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

یہ 1975ء کی بات ہے، میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کا امتحان دے کر اپنے آبائی شہر اوکاڑہ میں فراغت کے دن گزار رہا تھا۔ اسی اثناء میں اپنے ایک دوست کنور فاروق احمد سلیم کے توسط سے حکاس کنسٹرکشن کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر محمود الحق علوی سے ملاقات ہوئی۔ علوی صاحب کی کمپنی ان دنوں اوکاڑہ چھاؤنی میں سڑکیں بنانے میں مصروف تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں مَیں علوی صاحب کی سادگی، انکسار، صاف گوئی اور بے ساختگی سے بے حد متاثر ہوا۔

چند دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ محمود الحق اپنے بچوں کو انگریزی پڑھوانے کے لئے کسی ٹیوٹر کی تلاش میں ہیں چنانچہ اپنے دوست کنور فاروق احمد سلیم کی سفارش پر میں نے بلا تامل یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ میرے لیے یہ تجربہ نہ صرف انتہائی خوشگوار رہا بلکہ علوی صاحب کی طرح ماشاءاللہ ان کے بچے عرفان الحق، رافیلہ، عائشہ اور رابعہ انتہائی شائستہ، خوش خلق اور مؤدب تھے۔ نہ صرف محمود الحق اور ان کے بچوں بلکہ ان کی اہلیہ نے بھی ہمیشہ میری توقیر کی۔ رفتہ رفتہ علوی صاحب کے خاندان اور میرے درمیان ذہنی ہم آہنگی کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی کہ ہم ایک دوسرے سے دوستی کے ایک دیرپا رشتے میں منسلک ہوگئے۔

ایک دو بار محمود الحق علوی صاحب اپنے بچوں اور اہلیہ کے ساتھ میرے پاس پی اے ایف بیس لوئر ٹوپہ بھی تشریف لائے۔ اسی طرح میں بھی ہر مہینے ایک یا دو مرتبہ ان سے ملاقات کے لئے اسلام آباد میں واقع ان کے گھر حاضر ہوکر ان کی پرجوش میزبانی اور شفقت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب کبھی میں جمعہ کے روز ان کے ہاں پہنچا، میں نے علوی صاحب کو طویل نوافل اور وظائف میں مشغول پایا۔ وہ انتہائی رقت اور حضور قلب کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنے کے عادی تھے۔ ملازمت کے دوران میں جہاں کہیں بھی رہا علوی صاحب سے رابطہ کبھی منقطع نہ ہوا۔

میں علوی صاحب کی انسان دوستی کا شروع ہی سے معترف تھا۔ کئی دوستوں نے ان کے ایثار اور ہمدردی کے چند ایسے واقعات سنائے کہ میں ان کا پرجوش ارادت مند بن گیا۔ اوکاڑہ میں اپنے قیام کے دوران

علوی صاحب کا ہر شام معمول تھا کہ وہ اوکاڑہ کینٹ میں اپنے سائیٹ آفس جاتے ہوئے سب سے پہلے راستے میں سڑک کے کنارے واقع ایک چھوٹی سی کٹیا میں جا کر ایک ضعیف عورت کو سلام کرنے کے بعد انہیں نقد خیرات دیتے۔ راہگیروں اور مستحق افراد پر نظر رکھتے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی اعانت کرتے، اپنی گاڑی میں کئی جوڑے جوتے رکھتے تا کہ وہ ایسے مفلس لوگوں کو جن کے پاؤں ننگے ہوں یا جن کے جوتے بُری طرح پھٹے ہوں، انہیں جوتوں کے جوڑے دے سکیں۔ کئی بار اپنے ذاتی کوٹ چلتے پھرتے نادار فقیروں میں تقسیم کر دیتے۔

جونہی کسی سڑک کی تعمیر مکمل ہوتی علوی صاحب اپنی تمام ٹیم اور مزدوروں کے لئے فراخدلی سے ضیافت کا اہتمام کرتے اور خود مزدوروں کے درمیان بیٹھ کر کھانا تناول کرتے۔ اس کے علاوہ تمام عملے اور مزدوروں کے لیے روزانہ مفت لنگر کا انتظام ہوتا تھا۔

۱۹۶۰ کی دہائی میں جب لاہور میں گلبرگ ٹاؤن شپ کا آغاز ہوا تو محمود الحق علوی نے بھی اپنے محدود کاروباری وسائل سے کچھ رقم پس انداز کر کے اس سکیم میں ایک پلاٹ خرید لیا۔ ابھی تک ان کا کوئی ذاتی مکان نہیں تھا۔ یوں یہ پلاٹ ہی ان کی کُل متاع تھی۔ کچھ عرصے بعد گلاب دیوی ہسپتال کی انتظامیہ نے امراضِ قلب کا شعبہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور عوام الناس سے عطیات کی اپیل کی۔ محمود الحق اس کارِ خیر میں شرکت سے پیچھے رہنے والے کہاں تھے۔ اپنی بیوی سے ذکر کیا کہ وہ گلبرگ والا پلاٹ گلاب دیوی ہسپتال کو عطیہ کرنا چاہتے ہیں اس نیک بخت نے کوئی لیت و لعل نہ کی اور اسطرح علوی صاحب اپنے نیک ارادے کی تکمیل میں سرخرو ہو گئے۔ ایثار کی ایسی مثالیں ہمارے معاشرے میں کم ہی ملتی ہیں۔

جن دنوں اسلام آباد میں فیصل مسجد کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا' میں ایک روز F-6 میں واقع ان کی رہائش گاہ پر بغیر اطلاع چلا آیا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ فیصل مسجد کے لئے جگہ کو تیار کرنے کے لئے حکاس کمپنی نے کروڑوں روپے کا کام ثواب اور برکت کی غرض سے مفت انجام دیا۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو علوی صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ خلافِ معمول وہ خاصی دیر سے گھر پہنچے۔ ڈرائیور کی زبانی پتہ چلا کہ ایک مزدور بلڈوزر کی زد میں آ کر بری طرح زخمی ہو گیا تھا جسے علوی صاحب اپنی گاڑی میں ڈال کر خود پمز (PIMS) ہسپتال کی ایمرجنسی میں لے گئے اور اُس کے لئے بذاتِ خود خون کا عطیہ دینے میں ذرا تامل نہ کیا۔

ایک بار مجھے علی ٹرسٹ کالج واقع لہتراڑ روڈ میں زیرِ تعلیم طلباء کی سالانہ تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ طلباء نے اپنی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے۔ اختتام پر مجھے چند ستائشی کلمات کہنے تھے مگر اس دوران علوی صاحب بڑی عجلت سے ہال سے نکل گئے تا کہ ان کے کانوں میں ان کی تعریف و توصیف کی کوئی بھنک نہ پڑ سکے۔

گزشتہ چار دہائیوں میں مَیں نے محمود الحق علوی صاحب کی فیاضی اور خدا ترسی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جب بھی کسی ضرورت مند شخص یا طالب علم نے مجھ سے مالی اعانت طلب کی میں نے فوراً علوی صاحب کو SOS پیغام بھجوا دیا مگر مجال ہے کہ ان کے ماتھے پر کبھی شکن آئی ہو۔ ان کی مالی امداد کے باعث سینکڑوں لوگ انجینئرنگ' میڈیکل اور دیگر شعبوں میں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ ان کی فیاضی سے فیضاب ہونے والے چند لوگوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں' ان میں دو ڈاکٹر ہیں جن میں سے ایک صاحب پاک آرمی میں کرنل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ حال

ہی میں ایک غریب خاندان کے اکلوتے بیٹے نے نسٹ یونیورسٹی سے کمپیوٹر میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ آج کل لاہور میں ایک جاپانی کمپنی میں کام کررہا ہے۔ مئوخرالذکر کے والد خان پور میں سبزی منڈی میں بطور مزدور کام کرتے تھے۔ بیٹے کے یونیورسٹی تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے علی ٹرسٹ، جس کے محمود الحق صاحب صدر تھے اپنی آمدن کا 75% حصہ خیراتی کاموں اور فلاحی اداروں پر خرچ کررہا ہے جن میں ایک اعلیٰ معیار کا آئی ہسپتال، ایک ٹی بی کلینک متعدد تعلیمی اور فنی تربیت کے ادارے شامل ہیں۔ اس طرح ہر ماہ کروڑوں روپے کے مصارف ٹرسٹ کی زیرِ نگرانی ہورہے ہیں۔

علوی صاحب چاہتے تو اپنا فلاحی ایجنڈا چھوڑ کر پاکستان کے امیر ترین شخص ہونے کا اعزاز حاصل کر سکتے تھے مگر ان کی نظروں میں خدمتِ انسانی کے علاوہ سب اعزازات حقیر تھے۔ اس قدر کثیر سرمایہ خیراتی اور فلاحی کاموں پر خرچ کرنے کے باوجود وہ کئی دہائیوں سے ارب پتی تھے مگر ان کی عاجزی اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے کسی بھی رویے اور طرزِ عمل سے نخوت کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

علوی صاحب کا سادہ مگر برجستہ اندازِ گفتگو اپنے اندر خاصی جاذبیت رکھتا تھا۔ جب کبھی ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی تو انتہائی دلچسپ جملے سننے کو ملتے۔ ایک روز میں ان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں ایک پرانے سابق وزیر پہلے ہی سے براجمان تھے۔ مختصر سے تعارف کے بعد وہ میرے قریب چلے آئے اور اپنی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے۔ وہ علوی صاحب کے دیرینہ ارادت مندوں میں سے تھے اور کبھی کبھی اپنی نیاز مندی کے اظہار کے لئے اپنے مرشد سے ملتے رہتے تھے۔ وہ مسلسل اپنی تعریف و توصیف کے پُل باندھے جارہے تھے۔ اچانک علوی صاحب نے جو خود ستائش سے ہمیشہ گریز کرتے تھے یہ کہہ کر ان کے تمام توصیفی پل مسمار کر دیئے "بزمی صاحب، آپ ملک صاحب کو نہیں جانتے، یہ بہت بڑے آدمی ہیں" اور اس کے ساتھ ہی دلیل قاطع کے طور پر پنجابی کا یہ جملہ کہہ کر ملک صاحب کو اِدھر اُدھر بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا "پرانہاں دی پُوچھل چُک کے نہ دیکھنا" (مگران کی دُم اٹھا کر نہ دیکھنا)۔

میں نے انٹرنیٹ پر گوگل (Google) کے ذریعے ان کے بارے میں معلومات لینا چاہیں مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ان کے بارے میں اِس سے زیادہ کہ وہ حکاس نامی کنسٹرکشن کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں کوئی اہم معلومات نہ مل سکیں۔ اس کے برعکس مجھ ایسے ناچیز کے بارے میں گوگل (Google) پر درجنوں اندراجات موجود ہیں۔ بلاشبہ اگر درویشی اتنی سہل اور آسان ہوتی تو ہم میں سے اکثر اِس دولت سے مالا مال ہوتے۔

ان کی علالت سے قبل ہر ماہ تواتر سے ان کے دفتر علی ٹرسٹ فارم جانا میرے لئے واجب سے کم نہ تھا۔ ان کا لنگر روزانہ عین ایک بجے دوپہر شروع ہو جاتا تھا، ان کا دسترخوان ہر خاص و عام کے لئے کھلا تھا۔ کھانا کھائے بغیر وہاں سے جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اِس درویش بے مثل سے ہر ملاقات میرے لئے روحانی بالیدگی کا باعث بنتی رہی۔

ان کی علالت کے دوران میں تین چار بار ان سے ملنے گیا۔ ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ ان کی نحیف آواز کو سننا اور سمجھنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ مگر ان کی آنکھوں میں پرخلوص شفقت کی کرن کبھی ماند نہیں ہوئی۔

میں آج کل محمود الحق کے بارے میں ''خاموش درویش'' کے نام سے ایک

کتاب پر کام کر رہا ہوں۔ میری یہ حقیر کاوش نہ تو علوی صاحب کی وصیت کی تعمیل ہے اور نہ ہی یہ ان کے اہلِ خانہ کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ میرے ذمہ ایک بہت بڑا قرض ہے جس سے مجھے بہرحال سبکدوش ہونا ہے۔ اس درویش کی داستانِ ایثار پوری قوم کی امانت ہے۔ اس کتاب کا مقصد پاکستان اور بیرونِ پاکستان لوگوں کو یہ باور کروانا ہے کہ ہمارے ملک میں انسان دوستی کی شمعیں ابھی روشن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ محمود الحق کی عظیم انسان دوستی ہمارے اہلِ ثروت کو بالخصوص اور عوام الناس کو بالعموم فلاحِ انسانیت کا ولولہ تازہ عطا کرے گی۔

فلکیات

بگ بینگ (تخلیقِ کائنات)

فلکی طبیعات کے ماہرین ابتدائے کائنات کی وضاحت ایک ایسے مظہر کے ذریعے کرتے ہیں جسے وسیع طور پر قبول کیا جاتا ہے اور جس کا جانا پہچانا نام بگ بینگ ہے۔ بگ بینگ کے ثبوت میں گزشتہ کئی عشروں کے دوران مشاہدات و تجربات کے ذریعے ماہرین فلکیات و فلکی طبیعات کی جمع کردہ معلومات موجود ہیں۔

بگ بینگ نظریے کے مطابق ابتدا میں یہ ساری کائنات ایک بڑی کمیت (Primary Nebula) کی شکل میں تھی۔ پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی ''بگ بینگ'' (Secondary Seperation) ہوا جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر یہ کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج، چاند وغیرہ کی صورت میں آئی وجود میں آئیں، کائنات کی ابتداء اس قدر منفرد اور اچھوتی تھی کہ اتفاق سے اس کے وجود میں آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

قرآن پاک میں ابتدائے کائنات کے متعلق بتایا گیا ہے:

''کیا وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا'' (القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۰)

قرآنی آیات اور ''بگ بینگ'' کے درمیان حیرت انگیز مماثلت سے انکار ممکن ہی نہیں! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے عرب کے ریگستانوں میں ظاہر ہوئی، اپنے اندر ایسی غیر معمولی سائنسی حقیقت لیے ہوئے ہو؟

سورج سرد ہو جائے گا:

سورج کی روشنی ایک کیمیائی عمل کی مرہونِ منت ہے جو اس کی سطح پر گزشتہ پانچ ارب سال سے جاری ہے۔ مستقبل میں کسی موقع پر یہ عمل رک جائے گا اور تب سورج مکمل طور پر بجھ جائے گا جس کی وجہ سے زمین پر بھی زندگی ختم ہو جائے گی۔ سورج کے وجود کی بے ثباتی کے بارے میں قرآنِ پاک فرماتا ہے:

''اور سورج، اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے'' (القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۷)

(ماخوذ من خطبات از ڈاکٹر ذاکر نائیک)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

زاہد کون ہے؟

جب تک تو اپنے نفس اور اپنی خواہش کے ساتھ قائم ہے (مخلوق کو وعظ کرنا ترک کر اور ناصحانہ) گفتگو سے باز رہ۔ پس حق تعالیٰ جب تم سے کوئی کام لینا چاہے گا اس کے لئے خود تجھ کو تیار کر دے گا۔ وہ جب چاہے گا تجھ کو زندہ کر دے گا اور اہلیت نصیب فرمائے گا۔ وہ ظاہر کرنے والا بنے گا نہ کہ تو خود۔ اپنے نفس، اپنے کلام اور اپنے جملہ احوال کو اس کے حوالے کر (کہ جب جو کچھ مقدر ہوگا ہو کر رہے گا) اور خود اس کے کام میں مشغول ہو جا۔ عمل بن بلا گفتگو کے اخلاص بن بلا ریا کے، سرتاپاؤں توحید بن بلا شرک کے، گمنامی بن بلا شہرت کے، خلوت بن بلا خلوت کے اور باطن بن بلا ظاہر کے اور ارادہ کو باطن کر دینے سے باطن کے ساتھ مشغول ہو۔ تو اپنے قول ایاك نعبد و ایاك نستعین میں حق تعالیٰ کو خطاب کرتا اور اس کی طرف اشارہ کرتا ہے (کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) یہ لفظ یعنی تجھی کو خطاب ہے حاضر کے لئے کہ وہ ذات جو میرے قریب حاضر ہے۔ اے وہ ذات جو مجھ سے واقف اور میرے قریب ہے اور اے وہ ذات جو مجھ پر مطلع ہے۔ پس اپنی نماز میں اور اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں اسی طرح اور اسی نیت سے اس کو خطاب کیا کر۔ اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کر گویا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے پس اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔

حلال کھانے سے اپنے قلب کی صفائی کر۔ یقیناً حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اپنے نوالہ، اپنے لباس اور اپنے دل کو صاف کر، صوفی بن جائے گا۔ تصوف لفظ صفا سے مشتق ہے۔ (صوف سے نہیں) جس شخص نے (صوفی بننے کے لئے) صوف پہن رکھا ہے اور اپنے تصوف میں سچا ہے اس کا قلب مولا کے سوا تمام چیزوں سے صاف ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو کپڑوں کو رنگ سے متغیر کرنے اور (ریاکاری کی ریاضتیں کر کے) چیزوں کو زرد بنانے اور (پیروں کی صورت بنا کر) کندھوں کو اکٹھا کرنے اور بزرگوں کی حکائتیں بیان کرنے میں زبان چلانے اور کثرت درود و وظائف اختیار کر کے تسبیح و تسلسل میں انگلیاں ہلانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی طلب میں سچا بننے، دنیا سے بے رغبت ہو جانے، مخلوق کو قلب سے باہر نکالنے اور اپنے مولا کے سوا سب سے خالی ہو جانے سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ایک رات میں نے عرض کیا ''یا اللہ! ان نعمتوں کو مجھ سے مت روک جن کے ملنے سے میرا تو فائدہ ہے اور تیرا کچھ نقصان نہیں۔'' بار بار یہی دعا مانگی اور اس کے بعد سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا یوں کہتا ہے ''تو بھی تو اپنے آپ کو ایسے عمل سے مت روک جن کے کرنے میں تیرا فائدہ ہے اور ایسے ناجائز کام کرنے سے باز آ جن سے تیرا نقصان ہے کہ نعمتوں کے مستحق تو کام کے کرنے والے ہیں اور جسے اپنے نفع و نقصان کی خود فکر نہ ہو وہ ہم سے سوال کس منہ سے کرتا ہے۔

صاحبو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنے انتساب کو صحیح کرو۔ آپ کا اتباع جس کے لئے صحیح ہو جاتا ہے اس کا انتساب بھی صحیح ہو جاتا ہے اور اتباع کئے بغیر تیرا یوں کہنا کہ میں آپ کا امتی ہوں تیرے لئے مفید نہیں۔ جب تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال میں آپؐ کے متبع بن جاؤ گے تو دار آخرت میں تم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصاحبت نصیب ہوگی۔ کیا تم نے حق تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا کہ جو کچھ تم کو پیغمبر دے اس کو لو اور جس سے روکیں باز آ جاؤ' قلوب کے اعتبار سے اور آخرت میں قریب ہو جاؤ گے اجسام اور نفوس کے اعتبار سے۔

محمد ایوب' ایس سی ایم ای

سچی محبت

یہ ایک مصروف صبح کی داستان ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ایک بوڑھا شخص جو لگ بھگ 80 سال کا تھا اپنے انگوٹھے کے ٹانکے نکلوانے کیلئے آیا۔ اُسے 9 بجے کا وقت دیا گیا تھا مگر وہ جلدی میں تھا کہ اُسے 9 بجے کسی اور جگہ پہنچنا تھا۔ میں نے اہم معلومات لے لیں اور اُسے بیٹھنے کیلئے کہا کیونکہ اس کی باری آنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ جانے کا امکان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار گھڑی پر نظر ڈال رہا ہے اور پریشان لگتا ہے۔ اس بزرگ کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے میں نے خود اس کے زخم کا معائنہ کیا جو کہ مندمل ہوا دیکھ کر میں نے ایک ڈاکٹر سے مطلوبہ سامان لے کر خود اس کے ٹانکے نکال کر پٹی کر دی۔

میں نے اسی اثناء میں بزرگ سے پوچھا کہ ''کیا اُسے کسی اور ڈاکٹر نے 9 بجے کا وقت دیا ہوا ہے کہ وہ اتنی جلدی میں ہے؟''

وہ بولا کہ اُس نے ایک نرسنگ ہوم جانا ہے جہاں اُس نے 9 بجے اپنی بیوی کے ساتھ ناشتہ کرنا ہے۔

اس پر میں نے بزرگ کی بیوی کی صحت کے بارے میں پوچھا تو بزرگ نے بتایا کہ اس کی بیوی الزائمر بیماری کا شکار ہونے کے باعث کچھ عرصہ سے نرسنگ ہوم میں ہے۔

میں نے پوچھا کہ ''اگر وہ وقت پر نہ پہنچا تو اس کی بیوی ناراض ہوگی؟''

اُس بزرگ نے جواب دیا کہ ''وہ تو پچھلے 5 سال سے مجھے پہچانتی بھی نہیں ہے''

میں نے حیران ہو کر پوچھا ''اس کے باوجود آپ ہر صبح اپنی بیوی کے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں؟ حالانکہ وہ پہچانتی بھی نہیں کہ آپ کون ہیں''

بزرگ نے مسکرا کر کہا ''درست کہا کہ وہ مجھے نہیں جانتی مگر میں تو اُسے جانتا ہوں کہ وہ کون ہے''۔

یہ سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے۔ میں نے سوچا' یہ ہے محبت جو ہر انسان کو چاہیئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تحریر : محمد عبدالرحمٰن

معجزاتی مملکت

مملکت پاکستان کا قیام یقیناً ایک ایسا معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانانِ ہند کے لئے اس وقت رُونما فرمایا جب یہاں کے مسلمان معاشرتی اور معاشی لحاظ سے انگریز اور ہندو کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس معجزاتی ملک کا نظریاتی پس منظر، جغرافیائی محل وقوع، اس میں پائے جانے والے قدرتی وسائل کی بھرمار اور اس میں سکونت اختیار کرنے والے بیشتر مسلمانوں کی دین اسلام کے ساتھ جذباتی وابستگی کا وقتاً فوقتاً اظہار اس ملک کو سوائے سرزمینِ حرمین شریفین باقی تمام اسلامی ممالک سے منفرد بنا دیتا ہے۔

ملک کی چھیاسٹھ سالہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قیام کے بعد اسے قائم رکھنے کا اہتمام بھی یقیناً معجزاتی ہی رہا ہے۔ اس لئے کہ جس نظریاتی فکر (پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ) کے تحت اور جن مقاصد کے لئے یہ معجزہ رُونما ہوا آزادی کے بعد نہ ہی مقتدر ایوانوں میں ان نظریات کا حتی الوسع ادراک نظر آیا اور نہ ہی بحیثیت مسلمان عام و خاص پاکستانیوں میں اپنے نظریات کی قدر و قیمت کا احساس پنپنے پایا۔ اسی بنا پر من حیث القوم سیاسی حالات میں بھی متواتر منتشر رہے اور معاشی حالات بھی ابتر ہوتے رہے۔

بانیان پاکستان کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے قیام کا اصل مدعا تو جدید خطوط پر استوار ایک ایسا مثالی معاشرہ تشکیل دینا تھا جہاں اسلامی اقدار کی عملی ترویج ہو۔ عدل و انصاف کا بول بالا ہو نہ کسی کمزور کا استحصال اور نہ کسی طاقتور کی اجارہ داری ہو۔ لیکن افسوس کہ آزادی کے بعد مثالی اسلامی معاشرت تو دُور کی بات بحیثیت مجموعی نہ ہی اُس خوئے غلامی سے نجات پا سکے جو برطانوی سامراج کے طویل عرصہ کے تسلط نے مقامی مسلمانوں کے دل و دماغ میں بٹھا دی تھی اور نہ ہی اُس معاشی استحصال سے چھٹکارہ پا سکے جو سود پر قرضہ دینے والے ہندو بنیے نے اکثریتی مسلمانوں کی ایک عادت بنا رکھی تھی۔ خوئے غلامی نے گورے حکمرانوں کی جگہ مقامی وڈیروں اور افسر شاہی کی تابعداری تسلیم کرائی اور سود پر پیسے دینے والے ہندو بنیئے کی جگہ یہودی ساہوکار کے زیر تسلط چلنے والے عالمی مالیاتی اداروں نے پائی۔ چنانچہ جن بڑی قباحتوں سے چھٹکارے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے تاریخ کی سب سے بڑی جانی و مالی قربانیاں دیں ان میں سے پہلی قباحت کو تو حکمرانوں نے اپنے مقدر کا سکندر بنا لیا اور دوسری کو غربت و افلاس کے مارے عوام نے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اسی لئے بحیثیت قوم آج بھی ہم ایک کی بجائے دوہری غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں اور خوشحالی کی بجائے بھوک، افلاس، تعصّبات اور فسادات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوہری غلامی سے مراد حکمرانوں کی دھونس دھاندلی اور امریکی طاغوت کی تابعداری ہے، بھوک و افلاس کی وجہ ملکی وسائل پر چند

خاندانوں کا قبضہ اور عالمی مالیاتی اداروں کی قرضداری ہے اور تعصّبات و فسادات کی وجہ جہالت' بے روزگاری' بھتہ خوری اور مذہبی انتہا پسندی ہے۔ افسوس کہ ایسے تعصّبات کو کوئی قوم پرستی کا نام دے رہا ہے اور کوئی مقدس جہاد کے نام سے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہا رہا ہے اور قوم ایک بار پھر 1971ء جیسی خانہ جنگی جیسے حالات سے دوچار ہے۔

لیکن مذکورہ قباحتوں کے باوجود پاکستانی قوم کے مجموعی کردار کا ایک پہلو انتہائی مثبت اور اطمینان بخش ہے کہ عوامی اکثریت امریکی طاغوت کی مسلط کردہ موجودہ جنگ میں ہزاروں جانوں کی قربانیوں اور مالی نقصانات کے باوجود انتہائی حوصلہ افزا ہے اور اندرونی و بیرونی خطرات سے نپٹنے کے لئے عسکری قوت بھی' الحمدللہ' ہر لحاظ سے چاق چوبند ہے۔

حوصلہ افزا شاید اس لئے کہ پاکستانی قوم پر ایسے برے حالات کوئی آج کی بات نہیں بلکہ ہر چند سال بعد کسی نہ کسی نئی مصیبت کا سامنا آ جاتا ہے اور پھر ہر خاص و عام سیاستدان یہی کہتا سنا جاتا ہے کہ ''آج ملک جن خطرات سے دوچار ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔'' لیکن شانِ خداوندی دیکھئے کہ ہر بار مکمل تباہی سے بھی بچا لیتا ہے اور قومی وقار بھی۔ حالات متعدد بار انتہائی خطرناک ہوئے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس ملک کی سلامتی بھی قائم رکھتا ہے اور قوم کو مصائب و خطرات سے نپٹنے کا حوصلہ بھی بخش دیتا ہے۔ مثلاً روسی افواج افغانستان پر حملہ آور ہوئیں تو گرم پانیوں تک ان کی رسائی کا اندیشہ ملکی سلامتی کے لئے ایک یقینی خطرہ سمجھا جا رہا تھا لیکن پاکستان نے بزدلی کی بجائے عزم و ہمت سے کام لیا تو حملہ آور کامیابی کی بجائے اپنے ہی جغرافیہ میں ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اسی زمانے میں یہ حیرت انگیز واقع بھی ہوا کہ دشمن طاقتوں کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔ ایک معجزے کے اندر گویا دوسرا معجزہ یہ رُونما ہوا کہ جو قوم اپنے ملک میں گاڑی کا ایک انجن نہ تیار کر سکی ایٹمی اور میزائل ٹیکنالوجی میں دنیا کی طاقتور اقوام کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ ہندو دشمن نے کئی بار مشرقی سرحدوں پر اپنی افواج کو متحرک کیا لیکن سامنے ایٹمی قوت دیکھتے ہوئے ہر بار پسپا ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس ملک کی حفاظت میں پاکستانی قوم کا کردار تو بہت محدود بلکہ برائے نام ہی رہا اصل حفاظت تو وہی رب تعالیٰ فرما رہا ہے جس نے اڑسٹھ سال قبل لیلۃ القدر کا یہ معجزہ دنیا کے نقشے پر رُونما کیا اور پاکستانی حکمرانوں کی کھلی حماقتوں کے باوجود آج بھی اس قوم پر انتہائی مہربان ہے۔ قابل غور بلکہ سبق آموز یہ بھی ہے کہ جس کسی نے بھی (خواہ ملکی سیاستدان تھا یا دشمن حکمران) اِس معجزاتی ملک کو نقصان پہنچانے یا ختم کرنے کی سازش میں حصہ لیا عبرتناک انجام کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ایک بڑی وجہ تو یقیناً اس ملک کے لئے ان لاکھوں شہداء کے خون کی تکریم ہے جنہوں نے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نظریاتی ایجنڈے کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں اور دوسری بڑی وجہ شاید اس قوم کے اکثریتی مسلمانوں کی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص عقیدت و محبت ہے جس کا اظہار محراب و منبر کے علاوہ گاہے بگاہے گلی بازار میں بھی انتہائی جذباتی انداز میں نظر آتا رہتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ پاکستان جیسے جغرافیائی نوعیت کے معجزے نقوش عالم پر کم ہی رونما ہوتے ہیں لیکن ایک بار جب رونما ہو جائیں تو تکمیل مقاصد تک ملیا میٹ نہیں ہوتیں' خواہ دنیا بھر کی طاقتیں ان کی مخالفت میں نبرد آزما ہو جائیں۔ ریاست مدینہ کی مثال سامنے ہے کہ کفار کی بار بار یلغار کے باوجود نہ وجود میں ختم ہوئی اور نہ تکمیل مقاصد تک اس کے مکینوں کی جدوجہد میں کمی

آئی جبکہ جدوجہد کا مقصد دین اسلام کا پیغام پوری انسانیت تک پہنچانا تھا۔ پاکستان کا وجود بھی درحقیقت ریاست مدینہ ہی کا ایک پَرتو تھا لیکن افسوس کہ یہاں کے بیشتر حکمرانوں نے خلفائے راشدین جیسی حکمرانی کی بجائے اس معجزاتی ملک کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھا جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے امراء نے اُس اونٹنی کے ساتھ کیا جس کی تخلیق خلافِ معمول ہوئی اور جس کی تکریم کا حکم انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ پاکستانی قوم کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ریاست مدینہ کی کامیابی کا راز تو معاشرے میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ تھا جبکہ پاکستانی حکمران قرار داد مقاصد کی منظوری کے باوجود اسلامی نظام تو درکنار کوئی نظام بھی عملی طور پر لاگو نہ کر سکے۔ یعنی کبھی باوردی اور کبھی بے وردی حاکمیت لیکن دونوں کا طرۂ امتیاز خالص آمریت۔ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان لیکن نہ اسلامی اقدار کی طرف پلٹنا پسند کیا اور نہ جمہوری روایات کو پنپنے کا موقع دیا۔

ملک عزیز کو زمانہ مستقبل میں دیکھنے کے لئے لازم ہے کہ اس ملک کے مقاصد تخلیق کو بھی مدنظر رکھا جائے اور مروّجہ سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کا بھی بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔ مقاصد تخلیق کو دو جہتوں میں دیکھنا چاہیے۔ ایک تزویراتی جہت (strategic) اور دوسری عمومی جہت۔ تزویراتی یہ کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مدنظر مثالی اسلامی معاشرت کے قیام سے اسلام کا اصلاحی اور فلاحی پیغام پوری انسانیت میں عام کیا جائے اور عمومی یہ کہ اس خطے کے مسلمانوں کے دلوں میں پائے جانے والے جہادی جذبات کے ذریعے اسلامی دنیا کو جانب مشرق حفاظتی حصار کا احساس دلایا جائے۔ تزویراتی جہت کی شروعات تو اُس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ احادیث نبوی کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ الرضوان کا ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول نہ ہو جائے تا کہ ملت اسلامیہ میں فروغ پذیر فرقہ وارانہ اختلافات اور لسانی و علاقائی تعصّبات کا خاتمہ ہو۔ ہاں البتہ عمومی جہت جہادی عناصر کی صورت میں ایک عرصہ سے ایک مخصوص رفتار کے ساتھ عمل پذیر ہے۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان اور دیگر کئی اسلامی ممالک میں جاری جہاد اسی جہت کی صورت حال ہے اور غزوۂ ہند کی شکل میں دوسری جھلک دیکھنے کے لئے ہر مومن ایک مدت سے بے قرار ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار، کشمیری مسلمانوں کی ہندو فوج کے ظلم و استبداد کے خلاف چیخ و پکار، ہندو افواج کا پاکستان کو مشرق اور مغرب سے گھیر لینے کا گھناؤنا خیال اور پاکستانی حکمرانوں کا ملکی نظریاتی اقدار سے ارادی و غیر ارادی طور پر فرار اس خطے کے حالات کو اسی طرف لے جا رہا ہے جہاں تنگ آمد بجنگ آمد والا معاملہ ہوا کرتا ہے۔ خاندانی بادشاہت اور آمریت سے تنگ مسلم عوام کا عرب ممالک میں ہنگامہ خیز احتجاج اسی تنگی کی ایک مثال ہے جبکہ پاکستانی معاشرہ تو عرب ممالک سے بھی زیادہ گھمبیر صورت حال سے دوچار ہے۔ یہاں نسلی بادشاہت نہ سہی لیکن حکمرانوں کی من مانیاں اور جمہوریت کے نام پر اقتدار پانے والوں کی اقربا پروری اور لوٹ مار کی کہانیاں عوام کی بے چینی میں روز بروز اضافہ کر رہی ہیں اور عوام بھی ایسے جذباتی کہ ایک بار متحرک اور مشتعل ہو جائیں تو حصول مقاصد تک جان کی بازی لگا دینے سے گریز نہ کریں۔ قیامِ پاکستان کے لئے بے مثال قربانیاں، نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفاذ کے لئے 1977ء میں دیکھا جانے والا عوامی جوش و خروش، ماضی قریب میں عدلیہ کی بحالی کے لئے ایک منظّم تحریک اس قوم کے منفرد مزاج کی چند مثالیں ہیں۔

ضرورت تو محض قائداعظم جیسے کسی مخلص اور دیانتدار رہنما کی ہے جو جانب منزل قوم کی رہنمائی کر سکے۔لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ملک میں مروّجہ نظام کیا کسی ایسے رہنما کو سامنے لا سکتا ہے جو حضرت اقبال کے افکار اور قائدِ اعظم جیسے کردار کا حامل ہو؟ انتہائی مشکل! اس لئے کہ جس نظام میں تقویٰ بھی درکار نہ ہو، قابلیت وصلاحیت کا بھی کوئی معیار نہ ہو، عوامی اکثریت میں بھی جمہوری اقدار کا شعور وادراک نہ ہو جو ہوتا ہے، ہم اس سے آگاہ ہیں۔

سرمایہ داروں کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک مشہور قول کی تشریح میں سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی یہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ ''کوئی زر پرست قوم پرست نہیں ہوسکتا، محلات بنانے والے قوم نہیں بنا سکتے۔ جاگیردار اور سوداگر بنگلے بنانے، کارخانے لگانے اور منافع کمانے کے تو ماہر ہو سکتے ہیں رموز جہانگیری ان کے بس کی بات نہیں ہوتی اور جو حکمران اپنے ملک میں چور پر ہاتھ نہ ڈال سکیں وہ دشمن کی آنکھ میں آنکھ کیسے ڈال سکتے ہیں۔'' جبکہ بندوق برداروں کے بارے میں تاریخی تاثر یہی ہے کہ جرنیل مشکل سے مشکل میدان جنگ تو مار سکتے ہیں لیکن قومی قیادت ان کی پیشہ وارانہ تربیت کے خلاف ہے۔اسی لئے فوجی حکمران اکثر وبیشتر سیاسی عیاروں کی چالوں میں آ کر ملک کو نقصان پہنچا دیتے ہیں اور اسی لئے پاکستان میں مذکورہ دونوں نظام ناکام ثابت ہوئے ہیں۔یعنی فوجی آمریت کے ردِعمل میں پارلیمانی جمہوریت کا نام لیا گیا اور پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی پر فوجی مداخلت کو خوش آمدید کہا گیا اور آج ایک بار پھر تحریر وتقریر کے ذریعے قوم کو بہکایا اور پھسلایا جا رہا ہے کہ ''پاکستان کی بقا مروّجہ جمہوری نظام کے تسلسل میں ہے۔'' حالانکہ ملکی تاریخ گواہ ہے کہ اس نظام نے چند خاندانوں کی اجارہ داری کے سوا ملک وقوم کو نہ ہی پہلے کبھی کچھ دیا ہے (پچھلے پانچ سال تو بہت ہی بھاری ثابت ہوئے ہیں) اور نہ ہی آئندہ بہتری کی توقع ہے۔ویسے بھی اٹھارہ بار تبدیل کردہ آئین نہ اسلامی اقدار کی عملی ترویج کی بات کرتا ہے اور نہ انقلابی اقدام کے ذریعے قوم کو اتحاد ویکجہتی کی طرف لے جانے کی سکت رکھتا ہے۔ان حالات میں مستقبل قریب کا پاکستان بظاہر نہ داخلی لحاظ سے منظّم، مضبوط اور خوشحال دکھائی دیتا ہے اور نہ خارجی لحاظ سے اقوام عالم میں اس کا کوئی کردار نظر آتا ہے۔لیکن ماضی قریب کے ایک مجذوب صفت عظیم صوفی بزرگ حضرت محمد برکت علی رحمۃ اللہ علیہ (دارالاحسان فیصل آباد) کا یہ قول عقل وفہم کو حیران کر دیتا ہے کہ ''وہ دن دور نہیں جب پاکستان کی ہاں اور نہ پر اقوام عالم کے فیصلے ہوا کریں گے۔'' آج ملکی بدحالی دیکھتے ہوئے بظاہر تو یہ قول کسی دیوانے کا خواب اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ اس قول کے پورا ہونے کے دُور دُور تک کہیں آثار نہیں ملتے لیکن یاد رہے کہ مجذوب ہمیشہ وہی کہتا ہے جو اسے لوح محفوظ میں لکھا دکھایا جاتا ہے۔عقل سلیم اس قول کو حق اور سچ ماننے پر اس لئے بھی مجبور ہے کہ رب ذوالجلال کے فیصلے نہ ہی بے مقصد ہوا کرتے ہیں اور نہ منصوبہ بندی سے خالی۔

پاکستان جن مقاصد کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ان میں سے اہم ترین یقیناً غزوہ ہند ہی ہوسکتا ہے۔اس غزوہ کی شروعات کب اور کیسے ہوں گی اور اس کی تفصیلات کیا ہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن قابل غور ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک جو امریکی تھنک ٹینک پاکستان کو 2020ء تک

دنیا کے نقشے پر معدوم دیکھ رہے تھے آج وہی تھنک ٹینک 2030ء تک پاکستان کو اُن گیارہ سپر پاورز میں گن رہے ہیں جو اپنی مضبوط معیشت اور عسکری طاقت کے بل بوتے پر دنیا میں اہم ترین ہوں گے۔ (تفصیل کے لئے مطالعہ کیجیے چیف آف آرمی سٹاف کے دورہ امریکہ کے دوران ان کی پذیرائی کی) امریکی حساب دانوں کی اس سوچ کا انحصار یقیناً نہ ہی کسی مجذوب کی پیشن گوئی پر ہے اور نہ ہی ان کی ایجنسیوں کی خفیہ اطلاعات پر ہے بلکہ پاکستانی سرزمین پر پائے جانے والے قدرتی وسائل کی بھرمار اور دوران مصائب اس قوم کے غیر معمولی کردار پر ہے۔ انتظار تو محض کسی ایسے مردِ میدان کا ہے جو مومنانہ نعرے کے ساتھ قوم کو اس کے نظریاتی تشخص کی طرف واپس لے جا سکے۔

جی سی اسامہ بن ثناء : ایم سی ایس

پہلی پاکستانی خاتون کوہ پیما

1856ء میں جب ماؤنٹ ایوریسٹ کو دنیا کے بلند ترین پہاڑ کے طور پر شناخت کیا گیا تھا تو ساتھ ہی اس کی مہم جوئی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

جنکو تابی (Junko Tabei) وہ پہلی جاپانی خاتون کوہِ پیما ہیں جنہوں نے 1975ء میں ماؤنٹ ایوریسٹ کو سر کیا اور نذیر صابر پاکستان کے وہ پہلے کوہِ پیما ہیں جنہیں ماؤنٹ ایوریسٹ سر کرنے کا اعزاز حاصل ہے آپ نے یہ کارنامہ 2000ء میں سرانجام دیا۔

مئی 2013ء کو 23 سالہ ثمینہ بیگ نے 8848 میٹر بلند چوٹی کو سر کر کے ملک کے لئے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا اور دنیا کی چھت تک پہنچنے والی پہلی پاکستانی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

ثمینہ بیگ 19 ستمبر 1990ء کو گلگت بلتستان میں پیدا ہوئیں ان کا تعلق ہنزہ کی وادی شمستال سے ہے۔ ثمینہ بیگ آرٹ کی طالبہ ہیں اور 15 سال کی عمر میں اُنہوں نے باقاعدہ کوہ پیمائی شروع کی اس کے علاوہ ثمینہ بیگ وہ پہلی کوہِ پیما ہیں جنہوں نے 6000 میٹر بلند چوٹی چسکن سر (Chaskin Sar) کو سر کیا اور اُن کے اِس کارنامے پر اس چوٹی کو ثمینہ بیگ کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

دنیا کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنا اور اس پر پاکستان کا پرچم لہرانا ہمیشہ سے ثمینہ بیگ کی سب سے بڑی خواہش رہی ہے اور وہ ہمیشہ سے اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔ انہوں نے یکم اپریل 2013ء کو ماؤنٹ ایوریسٹ کو سر کرنے کے لیے باقاعدہ مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم میں آپ کے ساتھ ان کے بھائی مرزا علی اور دوسرے غیر ملکی کوہ پیما بھی شامل تھے اور بالآخر 19 مئی 2013ء کو ثمینہ بیگ دنیا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہوئیں اور دنیا کی چھت پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا۔

ہمالہ

اے ہمالہ ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستان! چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تُو پاسباں اپنا ہے تُو، دیوارِ ہندوستاں ہے تُو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تُو سُوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تُو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کُلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تُو
دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو

علامہ اقبالؒ

تحقیق و تالیف پیر اکرم

کوچۂ خیام کا ایک نابغہء روزگار فقیر

خالقِ کائنات گاہے بگاہے کچھ ایسے نابغہء روزگار انسان بھی تخلیق کر دیتا ہے جو قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دے دیتے ہیں کہ جو نہ صرف اپنی زندگی ہی میں (ایک مشہور روایت اور زندہ مثال) بن جاتے ہیں بلکہ اس دارِفانی سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کی صلاحیتوں، جوہر، ہُنر اور کارناموں کے نقوش جریدہء عالم پر اس طرح ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں کہ وقت کا ستمگر ہاتھ بھی ان کو دھندلا نہیں سکتا۔ وہ انمٹ نقوش ان کے عرصۂ زندگی کے بعد بھی برسوں تک بلکہ رہتی دنیا تک اپنے نقش گروں کی یادوں کو روشن، زندہ اور تازہ رکھتے ہیں۔

چند مثالیں

یورپ

دانتے (1265-1321) اطالوی شاعر، ڈیوائن کامیڈی کا مصنف

لیونارڈو ڈاونچی (1452-1529) اطالوی معمار، مصور، سنگتراش

مائیکل اینجلو (1465-1564) اطالوی سنگتراش، معمار، شاعر اور مصور

شیکسپیئر (1564-1616) انگلستان، شاعر، تمثیل نگار

گوئٹے (1749-1832) جرمن شاعر اور ڈراماٹسٹ

موزارٹ (1756-1791) آسٹرین موسیقار

ہیگل (1770-1831) جرمن فلاسفر

بیتھوون (1770-1831) جرمن نغمہ نگار

پابلو پکاسو (1881-1973) فرانسیسی نقاش، سنگتراش

برِصغیر

غالب، اقبال، ٹیگور، امیر خسرو، کالی داس، قاضی نذرالاسلام، وارث شاہ، تان سین، سہگل، لتا منگیشکر، میڈم نور جہاں، مہدی حسن، روی شنکر، بسم اللہ خاں، صادقین، عبدالرحمان چغتائی۔

ایران

سعدی شیرازی، کریما، گلستان، بوستان، کے مصنف، شاعر، فلسفی، ادیب، مصلح، صاحبِ حکمت

حافظ شیرازی، (خواجہ شمس الدین محمد) غزلیات کے مجموعہ دیوانِ حافظ کے مصنف

فردوسی طوسی، (950-1030 عیسوی) ملک الشعراء حکیم ابوالقاسم) محمود غزنوی کے دربار کا شاعر، منظوم تاریخ ایران المعروف شاہنامہ کا مصنف

مولانا رُومی، علامہ اقبال کے مُرشدِ روشن ضمیر (مرشدِ رُومی)

حالیہ مضمون اسی نابغہء روزگار شخصیت کے کارہائے نمایاں کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے مختص ہے جو انکساری سے خود کو فقیر کہتا ہے۔ جی ہاں! میری مراد **فقیر صادقین** سے ہے۔

تاریخ اور جائے پیدائش

سیّد صادقین احمد نقوی برطانوی ہندوستان کے شہر مروہہ میں 1930ء میں ایک خوش نویس اور خطاط افراد کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1940ء کے اواخر میں وہ ترقی پسند مصنفین اور آرٹسٹوں کی تحریک میں شامل ہوئے۔

امروہے میں ان کا خاندانی مکان سجاد منزل کے نام سے موسوم تھا۔ صادقین نے اُس زمانے میں اسی مکان میں اپنے فنکارانہ شوق پورے کیے۔

وہ اپنے سکول کے زمانے میں نصاب کی ہر جماعت میں اپنے ہاتھ سے کتابوں کے قلمی نسخے تیار کر کے خود ہی ان کی جلد سازی بھی کر لیتے تھے۔ ہر سالانہ امتحان کے بعد یہ قلمی کتابیں مجید تمبا کو فروش یا رام سروپ پنساری کی دکان پر ردی میں بیچ دی جاتیں جن کی مجموعی رقم تقریباً ایک روپیہ تک مل جاتی۔ صادقین اس رقم سے کاغذ اور رنگ خرید لیتے اور گرمیوں کی تمام چھٹیوں میں ان کا نقشہ نویسی اور تصویر کشی کا سلسلہ جاری رہتا۔

آپ کے دادا حافظ سیّد سبط احمد کے بڑے بھائی حاجی سیّد مقبول احمد نے امروہہ میں امام المدارس ہائی سکول کی بنیاد رکھی۔ بارہویں جماعت کا نتیجہ آنے کے بعد صادقین اسی مدرسے میں ڈرائینگ پڑھانے پر مامور ہو گئے، ستمبر 1946ء کی بات ہے اس میں جوڈرائینگ پڑھانے کا ہال تھا۔ صادقین نے چند ہی دنوں اور چند ہی راتوں میں خود ہی تصویریں بنا بنا کر سجادیا۔

صادقین کا کہنا ہے

''مَیں اپنے جملہ مشاغلِ فنی میں خود ہی اپنا شاگرد اور اپنا ہی استاد ہوں کیونکہ فقیر نے قُلزمِ خطاطی کی موجوں پر نامعلوم جزیروں، نامعلوم افقوں اور موہوم ساحلوں کی طرف بھی کشتیِ لوح و بادبانِ قلم کا رُخ بھی کیا ہوا ہے''

پڑھنے سے پہلے لکھنا آتا تھا

صادقین کا کہنا ہے:

''حافظہ بُرا نہ ہونے کے باوجود مجھے نہیں یاد کہ مَیں نے حروف ابجد کب سے لکھنے شروع کئے تھے، ماضی کے وہ دھندلکے جو میری یادوں کی سرحدوں کے اُس پار ہیں اُن میں بھی جب خود کو دیکھتا ہوں تو تختی پر ترچھے انداز میں رباعیاں لکھتا ہوا پاتا ہوں۔ مجھے پڑھنے سے پہلے لکھنا آتا تھا۔ الفاظ کے معنی تو درکنار، بغیر تلفظ جانے مجھے اُن کو نقل کر لینا آتا تھا۔ خود بخود ہی۔ لفظ کو مَیں ایک شکل سمجھ کر اُس کی تصویر اُتار لیا کرتا تھا، طرح طرح کی فنی دلچسپیاں تھیں جن میں ہر وقت جا و بے جا، موقع بے موقع محویت کا عالم رہتا تھا۔ لوگ میری کیفیات و انہماک کو دیکھ کر کہتے کہ یہ بچہ مجذوب معلوم ہوتا ہے اور جب ہی سے یہ زندگی کی رات لیلائے ہُنر کے فراق میں کٹتی چلی جا رہی ہے۔ شبستانِ وجود میں کبھی کبھی صرف اس کی پرچھائیاں نظر آجاتی ہیں۔

''لیلائے فنون کی نشانی کیا تھی
خطاطی و تصویر بنانی کیا تھی
بے چینی میں جاگ کر گزاری میں نے
اک ہجر کی شب تھی، زندگانی کیا تھی''

(صادقین)

فنِ جعلسازی

فنِ جعلسازی کے متعلق صادقین اس طرح رقم طراز ہیں:

''جعلسازی اگرچہ ایک خطرناک قسم کا فن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انتہائی باریک ہُنر بھی ہے۔ طبعاً ہی مَیں اس سے متنفر نہیں ہوں بلکہ اس کوچے میں پہلے تجربے کی وجہ سے سبق یافتہ بھی ہوں لیکن کسی بھی قسم کی جعل سازی اپنی شریعتِ زندگی، آئینِ تہذیب و قانونِ اخلاق میں جُرم کی بدترین قِسم ہے، ویسے یہ بھی اعتراف کرتا چلوں کہ فنِ جعل سازی میں بھی اپنی عمر میں دو تجربے کر چکا ہوں''

اپنے فنِ جعل سازی کے پہلے تجربے کے بارے میں صادقین نے لکھا ہے۔

''1938ء میں جب میں چوتھے درجے میں پڑھتا تھا مَیں نے ایک دن سکول سے چھٹی کے لئے عرضی لکھی۔ گھر والوں کو اس کی اطلاع دینے کی بھی مصلحت نہیں تھی۔ قاعدہ یہ تھا کہ سرپرست یا باپ کے عرضی پر دستخط ہونے ضروری تھے۔ مَیں نے والد صاحب کے دستخط خود ہی کر دیئے۔ دوسرے دن جب مَیں سکول پہنچا تو حاضری ہونے سے پہلے ہی ماسٹر ناظم حسین صاحب نے میری ٹھکائی شروع کر دی۔ وہ مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ تیرے والد کے دستخط سادہ ہوتے ہیں وہ ایسی شوشہ کاری کر ہی نہیں سکتے۔ یہ پیچ وخم اور یہ اس طرح سے گھومتا ہوا دائرہ احمد کی دال میں سے پیچ کھاتا ہوا سیّد کے سین میں ملتا ہوا تیرا ہی بنایا ہوا ہے۔ اسی طرح فنِ جعل سازی میں میرا پہلا ہی تجربہ بُری طرح ناکام رہا''

حماقت اخدائی قہر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے بلند آواز سے پکار کر کہا ''اے خدا کے رسول علیہ السلام! آپ اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ وجۂ خوف کیا ہے؟ آپ علیہ السلام کے پیچھے کوئی دشمن بھی تو نظر نہیں آتا۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں ایک احمق آدمی سے بھاگ رہا ہوں تُو میرے بھاگنے میں خلل مت ڈال۔'' اس آدمی نے کہا: ''یا حضرت آپ کیا وہ مسیحا علیہ السلام نہیں ہیں جن کی برکت سے اندھا اور بہرا شفایاب ہو جاتا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ اس آدمی نے کہا' کیا آپ علیہ السلام وہ بادشاہ نہیں ہیں جو مُردے پر کلامِ الٰہی پڑھتے ہیں اور وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''ہاں۔'' اس آدمی نے کہا: ''کیا آپ علیہ السلام وہ ہی نہیں ہیں کہ مٹی کے پرندے بنا کر ان پر دم کر دیں تو وہ اسی وقت ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں۔'' آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''بے شک میں وہی ہوں۔'' پھر اس شخص نے حیرانگی سے پوچھا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اس قدر قوت عطا کر رکھی ہے تو پھر آپ علیہ السلام کو کس کا خوف ہے؟'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس رب العزت کی قسم کہ جس کے اسمِ اعظم کو میں نے اندھوں اور بہروں پر پڑھا تو وہ شفایاب ہو گئے پہاڑوں پر پڑھا وہ ہٹ گئے۔ مُردوں پر پڑھا وہ جی اٹھے۔ لیکن وہی اسمِ اعظم میں نے احمق پر لاکھوں بار پڑھا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔'' اس شخص نے پوچھا: ''یا حضرت علیہ السلام یہ کیا ہے' کہ اسمِ اعظم اندھوں' بہروں اور مُردوں پر تو اثر کرے لیکن احمق پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ حالانکہ حماقت بھی ایک مرض ہے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ''حماقت کی بیماری خدائی قہر ہے۔

(حکایاتِ رومی)

صادقین کی صلاحیت اور فنی مہارت

صادقین کی فطرتی صلاحیتوں کو حسین شہید سہروردی نے دریافت کیا اور انہیں عوام و خواص میں متعارف کروایا۔ صادقین نے کچھ عرصہ پیرس میں گزارا اور اسی دوران اپنی ہنرمندی اور فنی مہارت میں اضافہ کیا۔

صادقین کے کارہائے نمایاں

تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد صادقین پاکستان کا بھرپور اور سب سے زیادہ ثمر آور نقاش اور مصور ثابت ہوا۔ وہ مستقل ایک وسیع پیمانے پر کام کرتا رہا۔ اس نے متواتر اس بات کا اعادہ کیا کہ وہ صاحبِ ثروت اور اربابِ اختیار و اقتدار کے ڈرائینگ روم سجانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس نے عوامی عمارتوں کے در و دیوار پر اپنی ہنرمندی کے نقش و نگار بنائے جو انسانیت کی اجتماعی مشقت اور محنت کے علمبردار ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ میں صادقین اولاً (ابتدائی طور پر) تصویروں، مجسموں کا مصور تھا جو ایک مثالی یا مجازی حیثیت کے حامل ہوتے تھے۔

MURALS (جداری نقش و نگار)

صادقین کو ایک معاشرتی مفسر یا حاشیہ نویس بھی کہا جا سکتا ہے۔ دیواروں پر بنائے ہوئے اس کے نقش و نگار ''دریافت'' کرنے کی ایک ازلی و ابدی ''جستجو'' کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے اندر موجود امکانی قوت کے مزید ارتقاء کا مطالبہ کرتے ہیں۔

صادقین کے یادگار فنی مظاہر (بطور دیوار کا نقاش)

دیوار کے نقش و نگار کا ماہرِ فن ہونے کی بنا پر اس کے 35 سے زیادہ فن پارے مندرجہ ذیل عمارتوں کی زینت میں اضافہ کئے ہوئے ہیں۔

سٹیٹ بنک آف پاکستان

پاور ہاؤس، منگلا ڈیم

لاہور میوزیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

بنارس ہندو یونیورسٹی

ہندوستان کا طبقات الارض کا ادارہ

فریئر ہال کراچی

پاور ہاؤس، ابوظہبی

پنجاب یونیورسٹی لائبریری

ادارہء اسلامی، دہلی

غالب اکادمی، دہلی

اجنتا اور ایلورا کے غاروں کی دیواریں

بطور شاعر، مُصوّر، خطاط

رُباعیاتِ صادقین نقاش 1390ء

رُباعیاتِ فقیر صادقین خطاط

* جزوِ بوسیدہ

نقوشِ اقبال (پیشکش مسلم کمرشل بنک)

فیض احمد فیض (صادقین) (پیشکش الفلاح بنک)

ادارہء اسلامی، دہلی کی دیواروں پر صادقین کے بنائے ہوئے نقش و نگار سات ہزار مربع فٹ کی جگہ کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔

1961ء میں صادقین نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کراچی کے ہیڈ آفس میں 62x10 انچ کے سائز میں ایک پرشکوہ منظر کے نقش و نگار بنائے جسے اس نے ''وقت کا خزینہ'' کے نام سے موسوم کیا اور اس میں سقراط سے علامہ اقبال اور آئن سٹائن تک کے زمانے کے دوران انسان کے ذہنی اور فہم و فراست کے ارتقاء کی منظر کشی کی۔ یہ ایک سیدھے خط میں

* فقیر صادقین کی انیسویں سال کی عمر تک کی وہ باقیات شاعری جو ضائع ہونے سے رہ گئیں

طولی اور مستقیم تخلیق ہے۔

پاکستان میں خطاطی کو دوسرے درجے کے فن پر دھکیل دیا گیا تھا حتیٰ کہ 1960ء کے اواخر میں صادقین نے خطاطی کے فن کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اسے اس طرح اپنایا کہ اسے ایک فن کے روپ میں ڈھال کر اسے خالص اور اول درجے کے فنون کے دھارے میں شامل کر دیا۔

صادقین پاکستان میں اسلامی خطاطی کے احیاء (نشاۃِ ثانیہ) کا علمبردار ہے۔ وہ ہمارے زمانے کا سب سے عظیم خطاط ہے جس نے فنِ خطاطی کو باطن نگاری کی مصوری میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ایک نقاش اور مصور سے اس کی بطور ایک خطاط کا یا پلٹ ایک الہامی اظہار ہے اس کے حروفِ تہجی میں حرکت ہے' کیفیتِ مزاج ہے' ان کے معانی میں جو پیغام ہے وہ اس کا بڑا واضح اور گہرا نقش پیش کرتے ہیں۔

آج پاکستان کے اکثر و بیشتر نامور خطاط صادقین کے مقلد ہیں چنانچہ آج پاکستان میں خطاطی فن کے منظر نامے پر نمایاں اور پیش پیش ہے۔

صادقین کا تعلق اس مکتبہء فکر سے ہے جس نے Realism یعنی حقیقت اور اصلیت کو Lyricism یعنی تغزل اور غنائیت سے مالا مال کر دیا۔

صادقین نے کلاسیکی ادب خصوصاً شاعری پر بھی مصوری کی ہے۔ اس میں فرانسیسی ناول نگار Albert Camus کے نوبل انعام یافتہ ناول The Stranger کو تشریحی تصاویر اور نقش و نگار سے مزین اور آراستہ کیا۔ اس مقصد کے لئے 1960ء کی دہائی میں فرانس کے صاحبانِ اقتدار نے صادقین کو دعوت دے کر فرانس بلایا تھا۔

اس کے علاوہ صادقین نے غالب' اقبال اور فیض کی شاعری کو کلاسیکی ادب میں ان کے مقام کے احترام میں کینوس پر مصوری میں ڈھالا ہے۔

نقوشِ اقبال پیشکش مسلم کمرشل بنک

قائدِ اعظمؒ کے فرمان

زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کام کیا جا رہا ہے وہ آئندہ آپ کو جاری رکھنا ہوگا۔ جو ذمہ داری آپ پر کل عائد ہونے والی ہے کیا آپ اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے اپنے کو تیار کر رہے ہیں؟ اپنے اندر اہلیت پیدا کر رہے ہیں؟ موزوں تربیت لے رہے ہیں؟ اگر نہیں تو جائیں آج سے تیاری شروع کر دیجیے۔ مستقبل کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے کا یہی زمانہ ہے۔

☆☆☆

الفاظ کی اتنی نہیں جتنی قدر و قیمت افعال کی ہوتی ہے' مجھے یقین ہے کہ جب پاکستان کے دفاع اور قوم کی سلامتی اور حفاظت کے لیے آپ کو بلایا جائے گا تو آپ اپنے اسلاف کی روایات کے مطابق شاندار کارناموں کا مظاہرہ کریں گے' مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے ہلالی پرچم کو سربلند رکھیں گے' مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی عظیم قوم کی عزت و وقار کو برقرار رکھیں گے۔

☆☆☆

حکومت کا پہلا فریضہ امن و امان برقرار رکھنا ہے تاکہ مملکت کی جانب سے عوام کو ان کی زندگی املاک اور مذہبی اعتقادات کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت حاصل ہو۔

☆☆☆

آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لئے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ ہے۔ آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دورِ حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد کیا ہو رہا ہے۔ ہماری قوم کے لئے تعلیم موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔

فیض احمد فیض ''اُمید سحر'' پیشکش بنک الفلاح (2012)

سچ بولنے والا

ایک انٹرویو میں صادقین نے کہا تھا:

''لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مَیں پھولوں، تتلیوں، قدرتی مناظر کی تصویر کشی یا نقاشی کیوں نہیں کرتا۔ مَیں ان سے کہتا ہوں کہ میں سچ اور اصلیت کا متلاشی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی روحانی تاثیر یا تخلیقی تحریک نہیں ملتی کہ کوئی شخص گلابی پردوں یا گلدان میں لگے گلاب کے پھولوں کے پسِ منظر میں اپنی تصویر بنواتا ہے۔ مجھے تو اس شخص سے تخلیقی تحریک ملتی ہے جو گھٹنوں سے فاقہ زدہ ہے اور اپنی بقا کے لئے جدوجہد میں مبتلا ہے۔ اس کے چہرے پر روشنی کی وہ ہلکی سی جھلک جو دن بھر کی مشقت کے بعد روٹی کے چند بچے کھچے ٹکڑے پا لینے کے بعد نمودار ہوتی ہے وہ مجھے بے حد متاثر کرتی ہے۔ مَیں حقیقت کے اظہار کا عکاس ہوں۔''

خود کو عاجزی اور انکساری میں فقیر کا اعزازی نام دینے والا صادقین اس معاشرے میں رائج دنیاوی حرص و ہوس، فکر و فریب، ریاکاری اور دورخی سے مبرا اور کوسوں دور تھا۔ وہ خود کو Speaker of Truth سچ بولنے والا کہتا تھا۔

صادقین نے اعزاز وصول کرنے کے لئے کبھی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی اور نہ ہی اعزاز سے وابستہ انعامی رقم وصول کی۔ اُس نے زندگی میں ہزاروں کی تعداد میں نقاشی، مصوری اور خطاطی کے فن پارے تخلیق کئے لیکن کبھی اپنا کوئی فن پارہ بیچا نہیں۔ اُس نے اپنے بیشتر فن پارے اپنے دوستوں کے علاوہ اپنے مخالفین حتیٰ کہ دشمنوں تک کو تحفتاً دے دیئے۔ اس کے کچھ فن پارے اُس سے جبراً لے لئے گئے اور کچھ چرا لئے گئے۔ اس کی زندگی میں دو گیلریاں اُس کے نام سے قائم کی گئی تھیں۔ ایک اسلام آباد میں اور ایک کراچی میں۔ آج دونوں گیلریاں معدوم ہیں اور ان میں موجود اس کے فن پارے غائب ہیں۔

راست گو حُسن کار

بہت سے مصوروں نے صادقین کے فن کی نقالی ہے۔ اس نقل نویسی سے ان نقاضوں نے بڑی بھاری رقمیں بٹور لی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ صادقین نے کبھی اپنے فن پاروں کو قیمتاً بیچا نہیں اگرچہ عوام اور شاہی خاندان کے افراد نے اس کے فن پارے خریدنے کے لئے بہت بھاری رقموں کی پیشکش کی ہیں۔ حال ہی میں لندن کے ایک نیلام گھر میں صادقین کی ایک پینٹنگ ایک لاکھ آٹھ ہزار امریکن ڈالر کے عوض فروخت ہوئی ہے۔ اُس کی سورۃ الرحمٰن کی شاہکار نقش گری نے عہدِ جدید کے بہت سے معروف مصوروں کو روحانی تاثیر اور تخلیقی تحریک مہیا کی ہے۔ کراچی کی بہت سی عمارتوں کی پیشانی اور بعض چھتوں پر اس سورۃ کی صادقین کے قطعی انداز میں نقش گری کی نقل دیکھی جاسکتی ہے۔

ناگ پھنی بطور علامت

1960ء کی دہائی میں صادقین اندرونِ سندھ کے ایک ایسے علاقے میں مقیم رہا جسے صحرا نے گھیر رکھا تھا۔ وہاں سوائے ناگ پھنی کے نہ کوئی چیز پیدا ہوسکتی تھی نہ نمو پاسکتی تھی۔ ناگ پھنی اس سنگلاخ، ریتلی زمین کا سینہ چیر کر پھوٹنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ اس حوصلہ دینے والی گرمی میں جنگلی ناگ پھنی کا پھوٹنا اور پھر اس قدر درشت اور بے رحمانہ ماحول اور حالات کے باوجود اپنے وجود کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوجانے کے اس نظارے نے صادقین کو بہت متاثر کیا۔ اُس نے ناگ پھنی کو اپنے نقاشی کے فن میں بطور علامت اختیار کرلیا۔ اس کے نزدیک ناگ پھنی فطرتی عناصر کی

رکاوٹ اور مزاحمت کے خلاف انسان کی مشقت' محنت' جدوجہد اور مستقل مزاجی کی فتح کی علامت بن کر ابھری ہے۔

1960ء ہی کی دہائی میں صادقین نے بے شمار نقشوں' خاکوں اور تصویروں کی مصوری کی جن میں مکڑی کے جالوں کی سیریز' Crow سیریز' کرائسٹ سیریز' Hope سیریز اور Sun سیریز شامل تھیں۔ یہ تمام سیریز دراصل صادقین کی اس زمانے میں معاشرے اور کلچر میں رائج الوقت معاملات اور حالات پر مصورانہ تبصروں' حاشیہ آرائیوں' نکتہ چینیوں اور تنقید پر مبنی تھیں۔ اُس نے ہزاروں کی تعداد میں رباعیات بھی لکھیں جو ہماری معاشرت' تہذیب اور ثقافت میں رائج بے دلیل اور غیر استدلالی اصولوں اور دعووں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس تناظر میں صادقین ایک معاشرتی مُفسر' حاشیہ نویس اور شارح کا روپ اختیار کر لیتا ہے جس نے بڑی کاریگری کے ساتھ طاقتور علامتوں اور گہرے رنگوں کی مدد سے اپنا پیغام کینوس پر منتقل کر دیا۔ وہ طبعاً کسی مخصوص صورتِ حال کی طرف اپنی سلسلہ وار مصوری کے ذریعہ اپنی توجہ مبذول کرتا جو ایک مشترکہ مضمون کے باوجود اپنی انفرادیت برقرار رکھتی۔ اس کی علامتیں وقت کے ساتھ اپنی شکل بدلتی رہتیں کیونکہ بدلتے احوال کے ساتھ وہ مطابقت رکھتا اور مناسب تبدیلی کر لیتا تھا۔

جداری نقش ونگار (Murals)

صادقین کے وسیع اور بڑے سائز کے جداری نقش ونگار (Murals) کا ذکر لازمی ہے جو پورے برِصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بنے ہوئے یہ نقش ونگار بنی آدم کی جدوجہد اور کشمکش' اس کے کارناموں' مستقل مزاجی' استقلال' اس کی غیر محدود اور لامتناہی امکانی قوت اور جذبہء دریافت کی تلاش کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان میں حرکت' عمل' سرگرمی' جوش اور بے پایاں ہمت ہے۔ یہ نقوش فکر' تصور' خیال کے حامل ہیں اور یہ ایک مخصوص موضوع کی کہانی کرتے ہیں اور اس کی تہیں کھولتے ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا Mural

صادقین کا دیواروں پر نقش ونگار کا سب سے عظیم الجثہ Mural منگلا ڈیم کے پاور ہاؤس میں بنا ہوا ہے۔ یہ دیواری نقش و نگار کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ اس کی پیمائش 200x30 ہے۔ صادقین نے اس پر رات دن کام کرتے ہوئے تین مہینوں کے ناقابل یقین اور حیرت انگیز قلیل عرصہ میں مکمل کیا۔ چنانچہ مناسب اور موزوں طور پر اسے The Saga of Labour کا عنوان دیا گیا ہے یعنی محنت اور مشقت کی داستان یا کارنامہ۔

یہ Mural نوعِ انسانی کی تاریخ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے کرداروں کو خراجِ تعظیم و احترام پیش کرتا ہے جو بلاشرکتِ غیرے مزدور اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو قدرت کے طاقتور عناصر کا سامنا کرتے ہیں اور ان پر قابو پانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

صادقین کے کارناموں کی داستان

صادقین کی پچیسویں 25 برسی فروری 2013ء کے موقع پر امریکہ میں قائم شدہ صادقین فاؤنڈیشن نے ان کی زندگی' شخصیت' فن اور کارناموں پر دو جلدوں میں مرتب کی ہوئی کتاب The Saga of Sadequain کی پاکستان کے شہروں کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں تعارفی تقریبات منعقد کی ہیں۔

یہ کتاب دو جلدوں میں 800 سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صادقین کے 500 سے زیادہ فن پاروں کے نقوش' تصاویر اور شبیہوں کے عکس موجود ہیں۔ پہلی جلد میں فنکار کی سوانح عمری کا بیان ہے۔ یہ

حصہ اس کی نجی زندگی اور فن پر ایک دریچہ وا کرتا ہے۔ اس کے بچپن سے عنفوانِ شباب تک کے حالات کا کھوج لگاتا ہے۔ اس مسافت کا ذکر کرتا ہے جو صادقین نے بطور نوعمر فنکار دریافت ہونے سے لے کر ایک درخشاں ستارے کا مقام حاصل کرنے تک کے سفر کے دوران طے کی حتیٰ کہ آخر کار فریئر ہال کراچی کی چھت پر ایک عظیم الشان یادگار نقش و نگار بنانے کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

جلد اول میں دی گئی تمام واردات اور بیانات کے مواد کا ماخذ یہ ہیں۔ ذاتی معلومات اور تجربات' خاندانی قصے کہانیاں' اخبارات میں شائع ہونے والے مقالات' ہم عصر فن کاروں' مصنفین' ناقدین' فن کے مؤرخین سے کئے گئے انٹرویوز' اور سب سے زیادہ اہم صادقین کے خود نوشت قلمی نسخے اور دستاویزات جن میں اس کی ابتدائی زندگی کے حالات کا ذکر ہے' اس کے سفرنامے' خطوط اور مجموعہ ہائے رباعیات کے خود تحریر کئے ہوئے دیباچے اور مقدمات۔

کتاب کی دوسری جلد صادقین کے ایسے فن پاروں کی نمائش کرتی ہے جو اب تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ یہ قارئین' ناظرین کو صادقین کے غیر معمولی اور نادر فن پاروں کے نمونے دیکھنے کا موقع میسر کرتے ہیں اس کتاب کے مصنف سلمان احمد پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں جو صادقین کے بھانجے / بھتیجے ہیں۔

صادقین کی عظمت کو سلام

موہٹا پیلس میوزیم کی سرپرستی میں حال ہی میں صادقین کے بارے میں ایک غیر معمولی اور قامت والی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ سات سو صفحات کی ضخامت پر مشتمل اس فیل پیکر کتاب کا وزن 12 کلوگرام ہے۔ اس کتاب میں صادقین کے مختلف فنی ادوار میں تخلیق کئے گئے چار سو فن پاروں کی شبیہیں شامل ہیں۔ یہ کتاب پاکستان کے اس عظیم فنکار کی قوتِ حیات و کار' اس کی جدت اور طرزِ نو' اس کے بے کلی اور مضطرب جوش' اس کی بے انتہا قوت استعداد کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔ برِصغیر میں کسی بھی فردِ واحد کی عظمت کو سلام پیش کرنے کا یہ سب سے عظیم اور انوکھا منصوبہ ہے۔

یہ کتاب صادقین کے شہرہء آفاق اور ممتاز ہم عصروں' صحافیوں' نقادوں' نثر نگاروں' اہالیانِ علم و فن کے صادقین کی شخصیت اور اس کے فن پر تحریر کئے گئے تبصروں' مضمونوں' مقالات' تاثرات' خاکوں' تنقیدی اور توصیفی تبصروں پر مشتمل ایک خوبصورت ادبی بیاض اور فنی گلدستہ ہے۔ کسی واحد فنکار پر ایسی مربوط اور کامل کتاب مرتب کرنے کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کتاب کے مضامین اور مصورانہ نقوش کے موضوعات میں کچھ عنوانات یہ ہیں۔

نیلگوں پُر جوش موسیقی

آگ میں پہیہ

نامختتم مقامِ کفّارہ

ایک طویل دن

جنت میں اجنبی

انسان کی غلامی اور پابندی

اس کے علاوہ غالب' اقبال اور فیض کے اشعار بڑے نمایاں نقش و نگار اور دل پذیر روشن رنگوں سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

The Holy Sinner:Sadequain

کیا ہم اس کتاب کے نام کا ترجمہ بطور ''پرہیز گار گنہگار: صادقین'' کر سکتے ہیں؟

تاریخ وار سلسلہء واقعات

1961: Painted Mural in Head office of State Bank of Pakistan titled "Treasure of Time"

1963: Visited USA. Several exhibitions

1964: Illustred"Le Etranger"

1967: Executed Mural titled "SAGA OF LABOUR"

1968: Mural titled "Quest of Knowledge" at Punjab University litrary

1969: Calligraphy of Sura-e-REHMAN

1973: Ceiling of Lahore Museum Entrance Hall depicting "Evolution of Mankind" 100x35 Feet

1974: Exhibitions in Middle East and Eastern Europe

1976: Series Mojiza-e-Fun

1977: Illustrated Ghalib

1979: Mural at Power House, ABU DHABI

1981: Tour of India, Murals at Aligarh Banaras, Hyderabad, Delhi

1985: Illustrated poetry of Faiz Ahmed Faiz

1986: Mural at ceiling of Frere Hall titled ARZ-O-SAMA (Earth and Heaven)

1987: February 10, 1987- Died

2000: Sadequain Institute of Arts and Information Technology (Simsit)

وفات اور تدفین

ستاون برس کی عمر میں 10 فروری 1987ء کی شب پچھلے پہر 2 بجے OMI کلینک کراچی میں صادقین نے اپنے خالقِ حقیقی اور نقش گر ازل کے بلاوے پر لبیک کہا اور اس دارِفانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ان کی آخری آرام گاہ سخی حسن قبرستان کراچی میں واقع ہے۔

اعزازات

1960: تمغہء امتیاز، حکومت پاکستان

1961: Paris Biennale

1962: پرائڈ آف پرفورمینس (صدارتی ایوارڈ)

1975: تہذیبی / ثقافتی ایوارڈ، حکومت آسٹریلیا

1980: ستارۂ امتیاز، حکومتِ پاکستان

2006: 14 اگست محکمہ ڈاک پاکستان نے یادگاری ٹکٹ شائع کیا

حوالے حاشیے

اس مضمون کی تحقیق و تالیف میں مندرجہ ذیل تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ترتیب راقم الحروف کی ہے۔

1۔ رُباعیاتِ صادقین نقاش 1390

2۔ چند رُباعیاتِ عاصی فقیر صادقین خطاط

3۔ جُزوِ بوسیدہ

4۔ نقوشِ اقبال (صادقین) مسلم کمرشل بنک

5۔ صادقین بنک الفلاح (2008)

6۔ اُمیدِ سحر (فیض احمد فیض) بنک الفلاح (2012)

7۔ روز نامہ ''دی نیوز'' بتاریخ 13 فروری 2012

8۔ انٹرنیٹ

عمر فاروق' فیکلٹی ممبر: ایم سی ایس

ویڈیو گیمز بارآور کیوں؟

ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے جس دور میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہمارے اردگرد موجود کئی اشیاء نے ہماری نئی نسل کو متاثر کیا ہے۔ انہی میں سے ایک ویڈیو گیمز ٹیکنالوجی ہے۔ ویڈیو گیمز ہر عمر کے کھیلنے والوں کے اندر ایک مثبت ذہنی تبدیلی لاتی ہے جو زیادہ تر کھلاڑی کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوتی ہے۔ جس میں اس کی تخلیقی صلاحیت' قوتِ فیصلہ اور تدریسی عمل میں واضح طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی قوتِ بینائی وقوت عمل بھی بڑھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ رات کے وقت بھی گاڑی چلاتے ہوئے انسان کی آنکھ اور ذہن مکمل طور پر حاضر ہوتے ہیں یعنی حاضر دماغی اور برجستگی ویڈیو گیمز کا ایک اضافی فائدہ ہوا۔

تاہم ہر چیز بغیر تحقیق وثبوت کے مان لینا آج کے انسان کا شیوہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی آف روچیسٹر (نیویارک) کے ماہرین تحقیق نے آزادانہ طور پر کسی بھی ویڈیو کمپنی یا ویڈیو گیمز بیچنے والوں کے تحفظات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے تحقیقی نتائج کچھ اس طرح پیش کئے ''وہ لوگ جو کمپیوٹر گیمنگ میں مصروف ہیں وہ 25 فیصد زیادہ' درست' بہتر اور جامع حکمت عملی اپنانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور ایک سیکنڈ کے اندر چھ گنا بہتر عملی قدم اور عام لوگوں سے چار گنا زیادہ اور فوری توجہ دے سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئے بغیر بیک وقت چھ چیزوں کو ذہن میں رکھ سکتے ہیں'' اس تحقیق میں جب عورتوں کا جائزہ لیا گیا تو وہ عورتیں جو ویڈیو گیمز کھیلتی ہیں سہ جہتی عوامل میں ہمیشہ مردوں سے آگے رہتی ہیں حالانکہ اس سے پہلے صورت حال اس کے برعکس تھی۔ اسی سوچ کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک ماہر نفسیات نے 1500 مڈل سکولز کے بچوں کا تین سال تک مشاہدہ کیا جو ویڈیو گیمز سے شغف رکھتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ان بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں اور حاصل کردہ نمبروں کا تقابل کیا گیا تو وہ ان بچوں سے زیادہ پائی گئیں جو ویڈیو گیمز نہیں کھیلتے تھے۔ یہ نتائج بغیر رنگ ونسل' قوم' ذات اور جنس کے حاصل کئے گئے۔ مگر شومئی قسمت' کچھ نقادوں نے اس کے اندر بھی کچھ ایسے پہلو نکال لئے جو قابل گرفت تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہا گیا کہ ویڈیو گیمز تشدّد اور تخریب کاری کی طرف راغب کرتی ہیں اور اس سے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور ذہنی بیماریاں جنم لیتی ہیں مگر شاید بھول گئے کہ' Harry Potter' Angry Birds' Farmville,Tetris وغیرہ جیسی گیمز نے نہ صرف قدیم Legends کو زندہ کیا بلکہ نیکی اور بدی کے درمیان تصادم میں نیکی کی جیت اور بھلائی کا تصوّر بھی دیا۔ پس یہی وجہ ہے کہ بہت سے سائنس دان بھی آج کل اپنی تجربہ گاہوں میں زیادہ بہتر گیمز کی تیاری اور پیش کش میں مصروف عمل ہیں۔ اسی حوالے سے ایک اور محقق کا کہنا ہے کہ گیمز میں نشہ اور تخریب کاری کی بجائے تعمیر کے پہلو کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اس خصوصیت کے پیشِ نظر ویڈیو گیمز کا مقابلہ نہ تو انٹرنیٹ اور موبائل سے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مشکل حسابی سوالات اس سے میل کھاتے نظر آتے ہیں کیونکہ ان میں تعمیر وتخلیق کا کوئی پہلو نمایاں نہیں بلکہ یہ صرف یادداشت' حافظہ اور لگے بندھے طریقوں اور لگاتار مشق پر مبنی ہوتے ہیں جب کہ ویڈیو گیمز کا ماہر ان صلاحیتوں سے کہیں آگے ہے۔

بقولِ شاعر

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

سعدیہ خاف' سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس

بنامِ رنگِ بے رنگ

پچھلے دنوں کافی عرصے بعد بارش کے بعد قوسِ قزح دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ سفید دھودھیا روشنی کی سات رنگوں میں تقسیم کا یہ منفرد نظارہ دیکھنے والے کو کچھ دیر کے لیے ضرور مسحور کر دیتا ہے۔ ہوا میں معلق بارش کے ننھے سے قطرے سے انعکاس کا عمل۔ یہ رنگ کچھ لمحوں کے لیے آسمان پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور پھر واپس اسی سفید رنگ میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ سفید رنگ جو اپنے اندر ہر رنگ کو سموئے ہوئے ہے۔ سفید جو بے رنگ اور بے داغ ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر نظارہ دراصل دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ ''حسنِ نظر'' شاید اسی کو تو کہتے ہیں۔ ایک دیکھنے والی آنکھ کو پرزم کے اس طرف بے رنگ روشنی کی بیم دکھائی دے گی دوسری آنکھ جس کی نظر ایک اور زاویے پر ہے اسے رنگ ہی رنگ دکھائی دیں گے۔ ہر رنگ کی ایک انفرادی حیثیت ہے ایک انفرادی پہچان ایک نام ہے جس سے وہ جانا جاتا ہے' اس کی اپنی خصوصیات ہیں' اس رنگ کی بھی اپنی پسند یا ناپسند ہے' کچھ رنگ ہیں جن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اس رنگ کو مزید ابھارتا ہے' اس کی شخصیت کو مزید اجاگر کرتا ہے لیکن کچھ رنگوں کے سامنے یہ بالکل دب جاتا ہے۔ یہ انفرادیت ہی اس رنگ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اس کی پہچان بنتی ہے۔ دیکھنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سفید دھودیا بے داغ روشنی بنانے کے لیے اس رنگ کو اپنی انفرادیت کھونا پڑتی ہے۔ ہر رنگ اپنی انفرادیت کھو کر ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر دوسرے رنگوں سے ملتا ہے تو یہ بے داغ روشنی وجود میں آتی ہے۔ کائنات کا سارا حُسن اسی بے رنگی اور خاموشی میں ہے۔ سات سروں میں کوئی ایک بھی اپنی انفرادی پہچان کی خاطر اپنے نام اپنی انا کی تسکین کی خاطر اونچا بولنا شروع کر دے تو جو چیز جنم لے گی اسے موسیقی نہیں شور کہا جائے گا۔ قطرہ اپنی انفرادی شناخت کے غم میں مبتلا رہے تو کبھی قلزم میں نہ بن سکے گا۔ رنگوں کے ملنے پر سُروں کے ہم آہنگ ہونے پر اور قطرے کے قلزم میں فنا ہونے پر کائنات مسکراتی ہے۔ انتشار فطری عمل نہیں ہے۔ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی ہے۔ اسی لیے انسانوں کو اتفاق' ہمدردی' امدادِ باہمی اور تعاون کا درس دیا گیا ہے۔ جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے کائنات کی اس ہم آہنگ خاموشی میں خلل پڑتا ہے۔ سُر آپس میں لڑتے ہیں اور شور وجود میں آتا ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہیں تو حسن وجود میں آتا ہے۔ انسانوں کو تسلیم کا ہنر سیکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ شیخ سعدی سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے؟ جواب دیا: اللہ تعالی کی نعمتیں کھاتے کھاتے دانت ٹوٹ گئے مگر زبان اُس کی ناشکری سے باز نہیں آتی۔

☆ عمدہ ترین کلام وہ ہے جو الفاظ کے اعتبار سے تو کم ہو مگر معنی کے اعتبار سے زیادہ ہو۔

حامد بلال

حضرت عثمان بن عفانؓ

آپ کو معلوم ہے کہ سعودی عرب کے ایک بینک میں خلیفہء سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آج بھی کرنٹ اکاونٹ ہے۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ مدینہ منورہ کی میونسپلٹی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر باقاعدہ جائیداد رجسٹرڈ ہے۔ آج بھی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر بجلی اور پانی کا بل آتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کے پاس ایک عالیشان رہائشی ہوٹل زیر تعمیر ہے جس کا نام عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوٹل ہے؟ تفصیل جاننا چاہیں گے؟ یہ وہ عظیم صدقہ جاریہ ہے جو حضرت عثمان بن عفانؓ کی صدق نیت کا نتیجہ ہے۔

جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں پینے کے صاف پانی کی بڑی قلت تھی۔ ایک یہودی کا کنواں تھا جو مسلمانوں کو پانی مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اس کنویں کا نام ''بئر رومہ'' یعنی رومہ کنواں تھا۔ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کون ہے جو یہ کنواں خریدے اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دے۔ ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں چشمہ عطاء کرے گا'' حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہودی کے پاس گئے اور کنواں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کنواں چونکہ منافع بخش آمدنی کا ذریعہ تھا اس لیے یہودی نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تدبیر کے مطابق کہا پورا کنواں نہ سہی، آدھا کنواں مجھے فروخت کر دو، آدھا کنواں فروخت کرنے پر ایک دن کنویں کا پانی تمہارا ہوگا اور دوسرے دن میرا ہوگا۔ یہودی لالچ میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ حضرت عثمان اپنے دن میں پانی زیادہ پیسوں میں فرخت کریں گے، اس طرح زیادہ منافع کمانے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے آدھا کنواں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان نے اپنے دن مسلمانوں کو کنویں سے مفت پانی حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے دن مفت پانی حاصل کرتے اور اگلے دن کے لیے ذخیرہ کر لیتے۔ یہودی کے دن کوئی بھی شخص پانی خریدنے نہیں جاتا تھا۔ یہودی نے دیکھا کہ اس کی تجارت ماند پڑ گئی ہے تو اس نے حضرت عثمانؓ سے باقی آدھا کنواں بھی خریدنے کی گزارش کی۔ اس پر حضرت عثمانؓ راضی ہو گئے اور پورا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اسی دوران ایک آدمی نے حضرت عثمانؓ کو کنواں دوگنا قیمت پر خریدنے کی پیش کش کی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ مجھے اس سے کہیں زیادہ کی پیش کش ہے۔ اس نے کہا میں تین گنا دوں گا۔ حضرت عثمانؓ نے

فرمایا مجھے اس سے کئی گنا کی پیش کش ہے۔اس نے کہا میں چار گنا دوں گا۔حضرت عثمان نے فرمایا مجھے اس سے کہیں زیادہ کی پیش کش ہے۔اس طرح وہ آدمی رقم بڑھاتا گیا اور حضرت عثمان یہی جواب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس آدمی نے کہا کہ حضرت آخر کون ہے جو آپ کو دس گنا دینے کی پیش کش کر رہا ہے؟۔حضرت عثمان نے فرمایا کہ میرا رب مجھے ایک نیکی پر دس گنا اجر دینے کی پیش کش کرتا ہے۔وقت گزرتا گیا اور یہ کنواں مسلمانوں کو سیراب کرتا رہا یہاں تک کہ کنویں کے اردگرد کھجوروں کا باغ بن گیا۔عثمانی سلطنت کے دور میں اس باغ کی دیکھ بال ہوئی۔بعد ازاں سعودی حکمرانوں کے عہد میں اس باغ میں کھجوروں کے درختوں کی تعداد پندرہ سو پچاس ہوگئی۔ یہ باغ میونسپلٹی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ وزارتِ زراعت یہاں کی کھجور بازار میں فروخت کرتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر بینک میں جمع کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اکاونٹ میں اتنی رقم جمع ہوگئی کہ مرکزی علاقہ میں ایک پلاٹ لیا گیا جہاں فندق عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر ایک رہائشی ہوٹل تعمیر کیا جانے لگا۔ اس ہوٹل سے سالانہ پچاس ملین ریال آمدنی متوقع ہے۔جس کا آدھا حصہ غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم ہوگا باقی آدھا حضرت عثمانؓ کے بینک اکاونٹ میں جمع ہوگا۔

اندازہ کیجیئے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انفاق کو اللہ تعالیٰ نے کیسے قبول فرمایا اور اس میں ایسی برکت عطاء کی کہ قیامت تک ان کے لیے صدقہ جاریہ بن گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ تجارت کی۔جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو قرض دیا،اچھا قرض، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں کئی گنا بڑھا کر لوٹا دیا۔

آبِ زمزم پر نئی تحقیق

جاپان کے مایہ ناز سائنسدان ڈاکٹر مساروایموٹو نے انکشاف کیا ہے کہ آبِ زمزم میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس کے سوا دنیا کے کسی بھی پانی میں موجود نہیں۔ انہوں نے نینو نامی ٹیکنالوجی کی مدد سے آبِ زمزم پر متعدد تحقیقیں کی ہیں جن کی مدد سے انہیں معلوم ہوا کہ آبِ زمزم کا ایک قطرہ عام پانی کے ایک ہزار قطروں میں شامل کیا جائے تو عام پانی میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں جو زمزم میں ہیں۔ڈاکٹر ایموٹو جاپان میں قائم ہیڈو انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیق کے سربراہ ہیں اور آج کل مملکت کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں کہا کہ جاپان میں انہیں ایک عرب باشندے سے آبِ زمزم ملا جس پر انہوں نے متعدد تحقیقیں کی ہیں۔تحقیق سے معلوم ہوا کہ زمزم کے ایک قطرے کا بلور ''ایک چمکدار معدنی جوہر'' انفرادیت رکھتا ہے جو دیگر کسی پانی کے قطرے کے بلور سے مشابہت نہیں رکھتا۔کرہ ارضی کے کسی خطے سے لئے گئے پانی کے خواص زمزم سے کسی طرح بھی مشابہت نہیں رکھتے۔انہوں نے لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعہ معلوم کیا کہ آبِ زمزم کے خواص کو کسی طرح بھی تبدیل کرنا ممکن نہیں۔اس کی اصل وجہ جاننے سے سائنس قاصر ہے۔زمزم کی ری سائیکلنگ کرنے کے بعد بھی اس کے بلور میں تبدیلی نہیں پائی گئی۔جاپانی سائنسدان نے مزید انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان کھانے' پینے اور ہر کام کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ جس پانی پر ''بسم اللہ'' پڑھی جائے اس میں عجیب قسم کی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے۔لیبارٹری ٹیسٹ کے ذریعہ عام پانی کو طاقتور خوردبین کے ذریعہ دیکھا گیا اور اس پر ''بسم اللہ'' پڑھنے کے بعد دیکھا گیا تو اس کے ذرات میں تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔بسم اللہ پڑھنے کے بعد پانی کے قطرے میں خوبصورت بلور بن گئے تھے۔انہوں نے کہا انہوں نے پانی پر قرآن مجید کی آیات پڑھوائیں تو اس میں بھی عجیب قسم کا تغیر واقع ہوا۔انہوں نے کہا کہ پانی میں اللہ تعالیٰ نے عجیب قسم کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ پانی میں قوتِ سماعت' احساس' یادداشت اور ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہے۔اگر پانی پر قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کی جائے تو اس میں مختلف امراض سے علاج کی صلاحیت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔پانی ماحول کے منفی اور مثبت حالات کا اثر قبول کرتا ہے۔ڈاکٹر ایموٹو نے کہا کہ کرہ ارضی کی تمام مخلوقات خواہ وہ بظاہر جمادات ہی کیوں نہ ہوں ان میں ماحول کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔کائنات کا ہر ذرہ شعور رکھتا ہے اور اسی شعور کے نتیجے میں وہ اپنے خالق کی تسبیح میں مصروف ہے۔

ڈاکٹر محمد حنیف: ایم سی ایس

غرناطہ میں چند روز

اِمسال ماہِ جولائی میں سپین کے شہر ''غرناطہ'' جانے کا اتفاق ہوا۔ بنیادی مقصد تو فزکس کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنا اور اپنا تحقیقی کام پیش کرنا تھا جس کے لئے مالی معاونت نسٹ کی طرف سے تھی۔ اس چھ روزہ کانفرنس میں کم وبیش 70 سے زائد ممالک سے آئے ہوئے تقریبا 400 مندوبین نے شرکت کی۔ اس طرح مجھے ایک ہفتے تک اس تاریخی شہر میں رہنے، گھومنے پھرنے، کھانے پینے اور سیّاحوں کی معروف جگہوں جن میں سب سے نمایاں ''الحمرا پیلس'' تھا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں مِلتِ اسلامیہ پر خاندانِ بنوامیّہ کی حکومت تھی۔ 711ء میں طارق بن زیاد نے شمالی افریقہ کے ملک مراکش کی طرف سے مغربی یورپ کے جنوبی حصّے پر مسلّط بادشاہ روڈرِک کی چیرہ دستیوں سے ستائی ہوئی عوام کی دعوت پر جبل الطارق ''جبرالٹر'' پر لنگر انداز ہوا اور تقریباً نو سال کے قلیل عرصے میں پورے علاقے جس میں موجودہ سپین اور پُرتگال کا سارا علاقہ شامل تھا۔ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور یہ علاقہ اُندلس کے نام سے مغربی یورپ کے نقشے پر تقریباً 450 سال تک موجود رہا جس کا دارالحکومت قرطبہ تھا۔ اور یہ علاقہ اموی سلطنت کے ایک صُوبے کے طور پر منسلک رہا۔ اندلس میں مسلمانوں کے انتہائی عروج کا زمانہ 1000ء تک رہا۔

اس عرصے کے دوران مسلمان حکمرانوں نے آرٹ، تعلیم، طِبّ اور سماجی خدمات کے حوالے سے ایک اعلیٰ اور جدید کلچر کو فروغ دیا۔ اُس وقت پورے اندلس میں پانچ لاکھ سے زائد مسلمان بستے تھے۔ جو کُل مقامی آبادی کا 80 فیصد تھے۔ پُورے علاقے میں ایک ہزار سے زائد مساجد بنائیں جن میں سب سے نمایاں ''مسجد قرطبہ'' تھی جو آج بھی موجود ہے۔ جس میں علامہ اقبال نے نماز بھی پڑھی اور مساجد مسلمانوں کے زوال کے بعد گرجا گھروں میں بدل دی گئیں۔ مسلمانوں کے اندلس میں عروج کے اس زمانے میں ہر سال خطاط 6000 سے زائد کتب زندگی کے مختلف شعبہ جات کے لئے تحریر کیا کرتے تھے جبکہ یورپ کے سب سے بڑے کتب خانے میں صرف 600 کتابیں موجود تھیں۔

1000ء میں بنوامیّہ کا دورِ حکمرانی ختم ہوا اور ان کی جگہ بنوعباس آئے۔ تو پھر اندلس کے اندر بھی زوال آنا شروع ہوا۔ مقامی مسلمانوں اور عرب مسلمانوں کے درمیان اقتدار کی رسّہ کشی شروع ہوگئی۔ اور اندلس کے اندر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی امارات وجود میں آ گئیں۔

اندلس کے شمال میں عیسائی بادشاہوں کے اندر اس عظیم سلطنت کے خاتمے کی ہوس جو گزشتہ 300 سالوں سے چنگاری کی طرح سلگ رہی تھی باہر آ گئی اور مسلمانوں کی اِن امارات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بالآخر 1236ء میں قرطبہ کی مسلمان سلطنت کا خاتمہ ہوا اور مسلمان سمٹ کر اندلس کے چند جنوبی علاقوں (جن میں غرناطہ، اشبیلیہ، الامیرہ اور مالاگا وغیرہ شامل تھے) تک محدود ہو کر رہ گئی جس کا دارالحکومت ''غرناطہ'' قرار پایا۔

مسلمان سپین میں 711ء میں آئے اور 1492ء میں ان کا دور ختم ہوا لیکن بلا شرکتِ غیرے حکومت 1236ء تک رہی۔ جو سقوطِ قرطبہ پر ختم ہوئی۔ لیکن 1186ء سے 1236ء تک کے 50 سال کا عرصہ خانہ جنگی میں گزرا۔ جس کا فائدہ شمال اور شمال مشرق میں واقع عیسائی ریاستوں آراگون اور کاسٹائل کے حکمرانوں کنگ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے اُٹھایا اور مسلمانوں کی مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی امارات کے خلاف یلغار کی جس کے نتیجے میں 1236ء میں سقوط قرطبہ ہوا۔ 1469ء میں دونوں نے شادی کر لی اور جدید سپین کی بنیاد رکھی۔ غرناطہ کی مسلمان سلطنت 1232ء میں بنو نصر کے عرب مسلمان امیر محمد اول ابنِ نصر سے شروع ہوکر 23 مختلف سلاطین کی حکمرانی سے گزر کر بالآخر 1492ء میں محمد دوازدھم کے دور میں زوال پذیر ہوئی۔ غرناطہ کی سلطنت تقریباً 250 سال تک قائم رہی لیکن ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے طور پر نہیں بلکہ فرڈیننڈ اور ازابیلا کی حکومت کے ٹیکس گزار کے طور پر۔

غرناطہ شہر کے جنوب میں واقع ایک پہاڑی پر 889ء میں مسلم دورِ حکومت میں ایک دفاعی قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں پر 1333ء میں سلطانِ غرناطہ یوسف اول نے ایک شاہی محل بنام ''الحمراء'' تعمیر کروایا۔ لہٰذا وہ پرانا قلعہ' شاہی محل' اُس کے ساتھ نئی تعمیر کردہ شاہی مسجد اور عام شہریوں اور سپاہیوں کے رہنے کا پورا کمپلیکس تقریباً 740ء میٹر لمبے اور 200 میٹر چوڑے مستطیل نما علاقے پر واقع ہے۔ اِس جگہ کی اصل وجہ شہرت ''الحمراء'' ہے جس کے لفظی معنی سرخ اینٹوں کا قلعہ کے ہیں۔ الحمراء پیلس 1233ء سے لے کر 1492ء تک ''سلطانِ غرناطہ'' کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر رہا۔

جو سیّاح سپین آئے وہ قرطبہ کی مسجد اور غرناطہ کا الحمراء پیلس نہ دیکھے یہ ممکن نہیں۔ الحمراء پیلس مسلمانوں کی فنِ تعمیر' کشیدہ کاری اور عربی فنِ خطاطی کا ایک عجوبہ ہے۔ جس میں عمارت کے مختلف حصّوں کے علاوہ فوارے اور ان میں پانی کی آج تک روانی' باغات اور پورے کمپلیکس کے گرد دوہری دیواریں اور مختلف دروازے وغیرہ اس کا طرّہ امتیاز ہیں۔ یونیسکو نے الحمراء کمپلیکس کو بین الاقوامی ورثے کا درجہ دیا ہوا ہے۔

گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ 1469ء میں فرڈیننڈ اور ازابیلا کی شادی کے بعد دونوں نے مل کر 1482ء میں ''اماراتِ غرناطہ'' کے خلاف فوجی اقدام شروع کیا اور غرناطہ کے گرد و نواح کے تمام علاقوں جن میں الامیرا' شبیلیہ اور مالاگا وغیرہ شامل تھے سب پر قبضہ کر لیا۔ فصلیں تباہ کر دیں اور غرناطہ کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ بالآخر سلطانِ غرناطہ سے گفت و شنید کر کے اس کو رات کی تاریکی میں خاموشی سے ''الحمراء'' پیلس سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور یوں 1492ء میں سقوطِ غرناطہ وقوع پذیر ہوا اور اِس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دورِ حکمرانی کا سورج جو 711ء میں اُندلس کے افق پر نمودار ہوا تھا وہ کم و بیش 800ء سال تک جگمگانے کے بعد 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد مکمل غروب ہو گیا۔

اِس کے بعد بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کی مکمل حکمرانی کا سورج طلوع ہوا۔ انہوں نے اندلس کے مسلمانوں کو یا تو عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا' یا پھر قتل کیا یا سپین چھوڑنے پر مجبور کیا۔ 1502ء میں سرکاری طور پر اسلام کو ایک غیر قانونی مذہب قرار دے دیا گیا۔ زبردستی عیسائیت قبول کروانے والے مسلمانوں کو Moricos کا نام دیا گیا۔ اُن پر گہری نظریں رکھی گئیں۔ بالآخر 1609ء میں کنگ فلپ آف سپین نے ایک فرمان جاری کیا اور تمام Moricos لوگوں کو 3 دن کے اندر سپین کو چھوڑ کر یا تو شمالی افریقہ کے ملک مراکش میں پناہ لینے یا پھر سلطنت عثمانیہ کے

کسی ملک میں جانے پر مجبور کیا۔اس طرح 1614ء تک آخری مسلمان بھی سپین کی سرزمین سے جا چکا تھا۔وہ علاقہ جہاں پر مسلمانوں نے کم و بیش 800 سال تک حکومت کی 5 لاکھ سے زائد مسلمانوں کے بسنے والے ملک میں جس میں 1000 سے زائد مساجد تھیں وہاں پر ایک بھی مسلمان اور ایک بھی مسجد کو باقی نہ چھوڑا گیا۔

ہماری گائیڈ ہمیں یہ سب معلومات دے رہی تھی میرے ذہن میں علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار جو انہوں نے بانگِ درا کی ایک نظم میں غرناطہ اور مسلمانوں کے زوال کے حوالے سے لکھے تھے گونج رہے تھے۔

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدرُوں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
تو کبھی اُس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حُسنِ عالَم سوز جس کا آتشِ نظّارہ تھا

ارشاد احمد : ایم سی ایس

عہد قدیم کے چند بڑے کتب خانے

قدیم تہذیبوں نے یونان، مصر، بابل، چین اور عراق کی وادیوں میں جنم لیا اس لیے مورخین کا خیال ہے کہ انسان نے پڑھنے لکھنے کی ابتداء بھی یہیں سے کی اور ابتدائی کتب خانوں کا قیام بھی انہی تہذیبوں کے مراکز سے ہوا۔ذیل میں مختلف ادوار میں قائم کیے گئے چیدہ چیدہ کتب خانوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سمیری کتب خانے (3200-2357 قبل مسیح):۔

سمیریوں نے سب سے پہلے تحریری نظام وضع کیا جسے ''خطِ مسیحی'' یا ''خطِ پیکانی'' کا نام دیا گیا جو کہ کتاب اور کتب خانوں کے مستقبل کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔تاریخی طور پر اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ سمیریوں نے 2700 قبل مسیح سے ذاتی، مذہبی اور سرکاری کتب خانے قائم کئے۔ان کتب خانوں میں ''تیلوح'' کا کتب خانہ جس میں 30 ہزار سے زائد مٹی کی الواح یا تختیاں موجود تھیں۔خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

بابلی کتب خانہ:۔اہل بابل (جو کہ سمیریوں کے متوازی تہذیب تھی) بھی کاروباری امور اور دیگر اہم واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے تھے۔لہٰذا ان کی کتب زیادہ تر سرکاری قوانین، تاریخ اور مذہبی موضوعات سے متعلق ہوتی تھیں۔یہ کہا جاتا ہے کہ بابل میں مندروں اور محلات میں متعدد کتب خانے موجود تھے کتب خانہ بارسپّا اس دور کا اہم کتب خانہ خیال کیا جاتا تھا۔

آشوری کتب خانے:۔آشوریوں کی سلطنت جو کہ بابلی تہذیب کی ہم اثر تھی، نے بھی سمیریوں کی زبان اور طرزِ تحریر کو چند ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اپنایا۔اس عہد کا عظیم کتب خانہ ''کتب خانہ سکندریہ'' تھا۔

مصری کتب خانے:۔اگرچہ اس عہد تک کتب خانوں کے باقاعدہ قیام کا ذکر نہیں ملتا تاہم وادی نیل میں فراعنۂ مصر کے مقبروں سے مٹی کے

مرتبانوں میں رکھے ہوئے قرطاس مصری کے ایسے رول یا کاغذ کے پلندے ملے ہیں جن پر خاندانی حالات' دلچسپ سفرنامے' شاہی فرامین وغیرہ درج ہیں ان دستاویزات کے چند بچے کھچے نمونے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔مصر سے برآمد ہونے والی ان تحریروں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت انسان نے شعوری طور پر اپنے تہذیبی اور علمی سرمائے کو محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔

تاہم 3000 قبل مسیح سے مصر میں باقاعدہ کتب خانوں کے قیام کا سراغ ملتا ہے۔مصر میں ہر مندر کے ساتھ ایک کتب خانہ اور سکول ہوتا تھا۔تحقیق سے مزید پتہ چلا ہے کہ ''غزہ'' میں 2500 قبل مسیح میں ایک کتب خانہ قائم ہوا تھا۔ریمسیس دوئم نے بھی 1250 قبل مسیح میں تھیس میں ایک کتب خانے کی بنیاد رکھی جس میں 20,000 رولز موجود تھے جو ذرات' فلکیات' تاریخ' آبپاشی' شاعری اور مراسلات کے موضوعات پر مشتمل تھے۔مندروں سے ملحقہ کتب خانوں کا سراغ کرنک' ڈینڈیرا اور ایڈفو میں محفوظ آثار کی دریافت سے لگایا گیا ہے۔

مصری لوگ' قرطاسِ مصری یا ''پپائرس'' کو تحریری مواد کے طور پر استعمال کرتے تھے۔اور رولز مٹی کے مرتبانوں میں رکھے جاتے تھے۔چونکہ اہل مصر' قرطاس مصری پر لکھتے تھے جو کہ دریائے نیل کے کنارے اگنے والے پودے کی چھال یا نرسل سے حاصل ہوتا تھا لیکن یہ دیرپا مواد نہیں تھا اس لیے قدیم مصری کتابوں کا وجود باقی نہیں رہا۔پرانے مصری مندروں کی دیواروں پر کندہ کٹیلاگ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کتابوں کو فن کے لحاظ سے رکھا جاتا تھا۔ادب میں نثر اور نظم کو الگ الگ جگہ دی جاتی تھی۔ایک خاندان کے کوائف اکٹھے رکھے جاتے تھے۔

رومی کتب خانے:۔ روم میں ابتداء میں تمام کتب خانے نجی یا ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے جس میں ''سسرو'' کا کتب خانہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اس کی وجہ کتابوں کے وہ ذخائر علمی تھے جو رومی سپہ سالار بیرونی ممالک سے جنگ کے بعد مال غنیمت کے طور پر اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ارسطو کا ذاتی کتب خانہ 86 قبل مسیح میں روم لایا گیا تھا۔''جولیس سیزر'' یا قیصر روم نے عوامی کتب خانوں کے قیام کا منصوبہ بنایا لیکن اس کی اچانک وفات کے بعد اس منصوبے کو' آگسٹس'' کے عہد تک عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا جبکہ ''پولیو'' نے روم میں 27-39 قبل مسیح کے دوران پہلا عوامی کتب خانہ قائم کیا۔چوتھی صدی عیسوی کے نصف تک روم میں 28 کتب خانے موجود تھے اور ان کے دروازے پر خاص و عام اور بلاتفریق غلام و آزاد کے لئے کھلے تھے۔''ایٹالڈز'' نے سکندریہ کے مقابل روم میں ''پرگامم'' جیسے عظیم کتب خانے کی بنیاد رکھی۔لیوسیس کا بیان ہے کہ ایسا ایک کتب خانہ 168 قبل مسیح ''پیسڈنا'' کی جنگ کے بعد مقرونیہ میں قائم ہوا تھا۔جس میں سیگو کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔''ورجل'' کی لائبریری اس کے دوستوں کے لئے عام کر دی گئی تھی 33 قبل مسیح میں ''آگسٹس'' نے دو کتب خانے اوکتاوین اور پلاتین میں اپنی بہنوں کی یاد میں قائم کیے تھے۔جن میں یونانی اور لاطینی زبانوں کی کتابیں موجود تھیں۔روم اور اٹلی کی دیگر شہروں اور قصبوں میں عوامی کتب خانوں کا قیام ایک معمول بن گیا تھا۔جن کو باقاعدہ شاہی سرپرستی حاصل تھی۔''بطلیموس'' نے بمقام ''قومو'' ایک کتب خانہ عطیہ کے طور پر قائم کرایا تھا۔اس کے بعد ''سوئس'' اور ''آرونیکا'' کے کتب خانے بھی اسی طرح وجود میں آئے۔

علاوہ ازیں ''طبرس'' ونسب پیشی ان ''ٹراجن'' نے بھی متعدد مقامات پر اٹلی اور دیگر صوبوں میں کتب خانے قائم کیے۔سپین کا کتب خانہ جس کی

بنیاد ''ٹراجن'' نے تقریباً 100 عیسوی میں رکھی جو پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہا' کا ذخیرہ کتب دو حصّوں یونانی اور لاطینی فن پاروں پر مشتمل تھا۔

کتب خانوں کی عمارات:۔ رومی عموماً یہ قدیم دستاویزات اور نادر مخلوطات اپنے گھروں کے خاص کمروں میں بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ جن کی حیثیت مسودات سے بڑھ کر تبرکات اور بیش قیمت فن پاروں کی سی ہوتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ کتب خانوں کی عمارات اور ان کے محل وقوع کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ کتب خانہ مندر اور گھر کا ایک ضروری حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کا رخ وہ عموماً مشرق کی سمت کرتے تھے تا کہ صبح کی روشنی وہاں تک آسانی سے پہنچ سکے اور کتابیں سورج کی گرمی سے نمی اور رطوبت سے محفوظ رہ سکیں۔ کتابیں چھوٹے کمروں میں رکھی جاتی تھیں۔ بڑا ہال باقاعدہ دارالمطالعہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس کے برعکس عوامی یا پبلک کتب خانے بہت وسیع ہوتے تھے۔ اور ان میں مشاہیر کی تصاویر بھی آویزاں ہوتی تھیں۔ کتب خانوں کو زیادہ پرکشش بنانے کے لئے قیمتی لکڑی' سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھروں سے عمارت کی تزئین و آرائش کر کے اس کے جاذبیت اور دلکشی میں اضافہ کیا جاتا تا کہ قارئین کو مطالعہ کے لیے پرسکون اور خوشگوار ماحول میسر آسکے۔

کتب کی فراہمی:۔ جہاں کتب خانوں کے لئے حصول کتب کے دیگر ذرائع کو استعمال کیا جاتا تھا وہاں پڑوسی ممالک سے فتوحات کے نتیجے میں بطور مال غنیمت بھی کتابیں اکٹھی کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ روایت بھی تھی کہ ہر مصنف یا ادیب اپنی کتاب کا ایک نسخہ ان کتب خانوں میں لازمی جمع کراتا تھا۔ ان کتابوں سے استفادہ کرنے کی ہر ایک کو اجازت تھی۔ ایک غلام بھی وہاں جا کر ان سے مستفید ہوسکتا تھا۔

سلام دینے کے آداب

رحمتِ عالم جب کسی کو سلام فرماتے تو تین مرتبہ السلام علیکم کہتے تا کہ جس کو سلام کہا جا رہا ہے وہ سن بھی لے اور سمجھ بھی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کمسن بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں بھی سلام سے مشرف فرماتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بچوں کے پاس سے گزرے تو انہیں سلام کہا اور فرمایا کہ میرے آقا بھی بچوں کو اپنے سلام سے نوازا کرتے تھے۔ امام ابوداؤد آپؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا' حضور بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل رہے تھے تو انہیں السلام علیکم کہہ کر سلامتی کی دعا دی۔

سلام دینے کے آداب

امام بخاری ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ''یہود کا ایک گروہ بارگاہ رسالت میں آیا اور کہا السام علیکم (ترجمہ: تم پر موت آئے) تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علیکم (تم پر بھی) حضرت عائشہ صدیقہ نے جب یہودیوں کی بات سنی تو آپ نے غصہ سے بے قابو ہو کر فرمایا ''السام علیکم لعنکم وغضب علیکم.... ترجمہ: تم پر موت آئے' اللہ تم پر پھٹکار بھیجے اور اس کا غضب تم پر نازل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام المومنین کو فرمایا ''اے عائشہ تمہیں نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے اور فحش کلامی سے دور رہنا چاہیے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! انہوں نے جو بدکلامی کی ہے آپؐ نے نہیں سنی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ جو جواب میں نے انہیں دیا ہے وہ تو نے نہیں سنا۔ میں نے وہی چیز ان کی طرف لوٹا دی ہے۔ میں نے ان کے بارے میں جو کہا ہے وہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگا اور انہوں نے میرے بارے میں جو کہا وہ مسترد کر دیا جائے گا۔

سلام دینے کے آداب

امام بخاری نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک روز نبی کریم کا گزر مسجد میں سے ہوا۔ خواتین کا ایک گروہ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ سے انہیں سلام فرمایا۔

این سی خرم عظیم ملك : ایم سی ایس

بیک بینچرز

جن لوگوں کا خیال ہے کہ کلاس روم میں آخری سیٹوں پر ہمیشہ سست اور نالائق طالبِ علم بیٹھتے ہیں تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔

حقیقت میں آخری سیٹیں ہونہار اور ذہین طلباء کی روایتی جگہ ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں طالبِ علم ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہوتا ہے پس اس کا ذہن اچھی طرح کام کرتا ہے۔ پیچھے بیٹھنے والے بڑی خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ کے علاوہ آگے بیٹھنے والے طالب علموں کی عیب جوئی کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔

پیچھے بیٹھنے والے طالب علموں کا بہترین مشغلہ ''ٹیبل رائٹنگ'' ہوتی ہے۔ آپ کو زیادہ تر پچھلے ٹیبلز ''آرٹ ورک'' سے بھرے ملیں گے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ کاغذ کی بچت ہے چونکہ طلباء اپنے والدین کا کافی پیسہ لگا کر یہاں پڑھتے ہیں اسی لیے بہت سے طلباء ابھی سے اس قرض کو چکانے کی خاطر کاغذ کی بجائے ٹیبل کا استعمال کرتے ہیں یعنی ایک تیر سے دو شکار، دوسرا یہ کہ بعض اوقات لیکچرز کاپی پر نوٹ کرنے کا دِل نہیں کرتا تو ایسے میں ٹیبل رائٹنگ ان کا بہترین ساتھ دیتی ہے۔

دورانِ لیکچر اپنے دوستوں سے گفتگو کرنے کا آسان ذریعہ بھی ہے۔ جہاں یہ ان کے دِل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں وہاں یہ پڑھنے والوں کا دِل بھی بہلاتے ہیں۔ کہیں آپ کو لکھا ملے گا ''کبھی آؤ ناں مردان خوشبو لگا کے''، یعنی یہ طلباء مہمان نواز بھی ہوتے ہیں۔ کہیں لکھا ملے گا ''دِل ہے تو محبت ہے محبت ہے تو عشق ہے، عشق ہے تو تڑپ ہے، تڑپ ہے تو درد ہے، درد ہے تو۔۔۔lodex ہے نا۔۔۔!'' اس سے کسی کو فائدہ ہو نہ ہو اس کمپنی کو ضرور فائدہ ہوگا جو lodex بناتی ہے۔

پیچھے بیٹھ کر اہم موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کیا جاتا ہے فلموں اور اہم گانوں کی لسٹیں بھی تیار کی جاتی ہیں کارٹون بنا بنا کر پسندیدہ لوگوں سے انتقام لیا جاتا ہے۔ وہ کرسی پر ایسے بیٹھتے ہیں کہ صرف سَر نظر آتا ہے باقی جسم ڈھیلا چھوڑ کر ٹانگیں پھیلا دیتے ہیں مگر سر کو ایسی حالت میں رکھتے ہیں کہ اساتذہ یہ سمجھیں کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے ساتھ ساتھ ذہن نشین بھی کر رہے ہیں۔

حالانکہ وہ اس دوران دنیا بھر گھوم آتے ہیں۔ اسائنمنٹس کے 'چھاپے' مارے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ اپنے سے آگے بیٹھے طالب علموں کو تنگ کر کے ان پر دِل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی کلاس روم میں آئیں بھرپور کوشش کریں کہ پچھلی سیٹوں پر قبضہ کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مستفید ہوا جا سکے۔

این سی حسن مثنیٰ جعفری : ایم سی ایس

بیٹھک سسٹم اور جدید سماج

زندگی میں بہت سے وجود کچھ خوبصورت یادوں کے سہارے روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مجھے آج بھی آنکھ بند کرنے پر برگد کا وہ بوڑھا دیو قامت پیڑ' اس کے سائے میں بچھی چارپائیاں اور اس پر بیٹھے خوشبودار نفوس نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کی شاخ سے بندھا جھولا ہلتا محسوس ہوتا ہے۔ سماعتوں میں کِھلکھلاہٹیں مچلنے لگتی ہیں۔ نگاہوں میں سرخ و سفید آنچل اٹھکیلیاں کرنے لگتے ہیں گویا ہر جانب رنگ و نور کا میلا سج گیا ہو۔ کتنا حسین ہے سب۔ مگر!

آنکھیں تو کھولنا پڑیں گی۔ روشنی کو دیکھنا تو پڑے گا وہ سب روشنی جو اَب مجھے رفتہ رفتہ اندھیروں میں لے جا رہی ہے! بلکہ ہم سب کو' ہم سب آہستہ آہستہ دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ شاید ہمیں اس کا اندازہ نہیں۔ آنکھیں کھولنے پر میرے سامنے وہی پلاسٹک کا ایک مشینی ڈبہ موجود ہے۔ بالکل چھوٹا سا اور اس میں قید دنیا بالکل ایسے ہی جیسے ایک ظالم دیو کی قید میں ایک ننھی شہزادی۔

برگد کے سائے تلے موجود دنیا اور اس پلاسٹک کے ڈبے (کمپیوٹر) میں موجود دنیا میں کتنا فرق ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری ثقافت' ہماری تہذیب و تمدن کا وہ حصہ جسے بیٹھک کہا جاتا تھا اسی ڈبے کے کسی کونے میں کسی حنوط شدہ لاش کی مانند موجود ہے۔

بیٹھک سسٹم ہماری روایات کا سنہرا باب جو کہ اب خال خال ہی نظر آتا ہے۔ خاندانی میل ملاپ کے وہ قیمتی لمحات جس میں دن بھر کی مصروفیات کا تذکرہ اکٹھے بیٹھ کر کیا جاتا ہے اور خلوص اور محبت سے ایک دوسرے کے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے اور یوں ہی خوش گپیوں میں دن بھر کی تھکن کہیں کھو سی جاتی ہے۔ مگر آج اس بیٹھک سسٹم کی جگہ ایک کمپیوٹر اور سوشل میڈیا نے لے لی ہے۔ ایک ہی کمرے میں موجود چھ سات نفوس چیدہ چیدہ ہی ایک دوسرے سے بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جوں جوں سرمایہ داری نظام نے ترقی کی انسان کے کام کے اوقات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آئینہ دیکھنے کا وقت بھی دستیاب نہیں اور اس کے ساتھ ہی اخلاقی ترقی کو پانے کے اوقات رفتہ رفتہ دم توڑ دیتے ہیں۔ اور اسی وقت کی کمی کا آسان علاج سوشل نیٹ ورکنگ کی صورت میں پیش کیا گیا مگر کیا یہ اس سسٹم کا نعم البدل ہے جو کہ ہمارے اپنوں کے حقیقی دکھ درد کو سمجھنے میں معاون تھا۔

سوشل میڈیا میں یک بڑا نام ''فیس بک'' کا ہے دنیا کے 845 ملین لوگ اسے استعمال کرتے ہیں جن میں سے 8.27 فیصد نوجوان طبقہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فیس بک لوگوں میں رابطے کا ایک ذریعہ ہے۔ فیس بک بنایا تو شاید اسی مقصد کے لیے گیا ہو مگر آج بھی دلوں میں فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہمارا بیٹھک سسٹم' فیس بک' ٹوئٹر اور فرینڈ سٹر جیسی بہت ساری

ویب سائٹس میں تبدیل ہو چکا ہے۔مگر یہ سب کیا ان لمحات کا نعم البدل ہیں جو کہ خاندانی بزرگوں کی صحبت میں گزارے جاتے ہیں۔

سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کا ایک مثبت پہلو یہ نظر آتا ہے کہ جو لوگ زمینی فاصلے میں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں رابطے میں رہ سکتے ہیں۔لیکن یہ رابطہ کم اور رابطوں کی تعداد زیادہ ہے۔

مگر کیا ان سائٹس کا استعمال اس مقصد کے لئے ہو رہا ہے ان کا استعمال زیادہ نوجوان طبقے کے ہاں ہے جو کہ اپنی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتحال سے دوسروں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ یہاں تک اس نشے کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالنے سے پہلے لوگوں کو بتانا پسند کرتے ہیں اور یہی حرکت ہماری بہت سی ذاتی اور قیمتی معلومات ان لوگوں تک پہنچا دیتی ہے جو کہ ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر اغواء کار گروہوں سے۔اور بعض اوقات یہی لمحے لمحے کا سٹیٹس گلے کا پھندا بھی ثابت ہوتا ہے یہ سائٹس رابطہ کار کم اور پروپیگنڈا سائٹس زیادہ ہیں۔

ہماری نوجوان نسل جس پراگندگی کا شکار ہو رہی ہے وہ انہی کی مرہونِ منت ہے۔نوجوان بہت سی چیزوں کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں اور جن مفاد پرست طبقوں نے کوئی بھی وبا نوجوانوں میں عام کرنی ہو وہ اسی سوشل نیٹ ورکنگ کا سہارا لیتے ہیں پھر چاہے وہ مخالف گروپ کی جانب سے ہو یا اپنی پروموشن، بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے اور اخلاقی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ وقت گزاری کے لیے مختلف عنوان بناڈالے ہیں۔

ان سب سے ہمیں اور ہمارے بچوں کو حاصل کیا؟ کیا آپس میں رابطے کا یہی حل اکیسویں صدی کے ذہن و بہترین دماغوں نے پیش کیا ہے۔کیا یہ ہمارے لیے گھاٹے کا سودا نہیں؟ کیا ان سب سے فوائد چند مفاد پرست

حضرت آدمؑ کو تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام اولاد جس کو اس دنیا میں آنا تھا دکھائی تھی۔ان میں ایک انسان بہت ہی نورانی اور باقیوں سے ممتاز تھا۔آدمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دریافت فرمایا یہ کون ہے۔اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ تیرا بیٹا داؤدؑ ہے۔آدمؑ نے دریافت کیا کہ اس کی عمر کتنی ہو گی تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اس کی عمر 60 سال ہو گی۔آدمؑ نے کہا کہ یہ عمر تو بہت کم ہے۔یا اللہ میری عمر کم کر کے 40 سال داؤدؑ کو عنایت فرما دیں۔لہٰذا ایسا ہی کیا گیا۔جب فرشتہ حضرت آدمؑ کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچا تو آدمؑ نے کہا کہ میری عُمر تو ابھی ایک ہزار سال نہیں ہوئی۔مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ایک ہزار سال کی عمر پاؤں گا۔تو فرشتے نے یاد کروایا کہ آپ نے اپنی عمر کے 40 سال اپنے بیٹے داؤدؑ کو دے دیئے تھے۔

(قصص الانبیاء)

طبقے ہی نہیں اٹھا رہے؟

ایک ہی کمرے میں ایک ہی چھت تلے بیٹھے نفوس کے پاس ایک دوسرے سے بات کا وقت نہیں لیکن فیس بک کے لیے سارا دن حاضر ہے یہی حال رہا تو وہ وقت دور نہیں جب بیٹے کا باپ سے پہلا تعارف فیس بک پر ہی ہو گا۔کیا یہ فیس بک اور ایسا بہت کچھ اس صحبت کا نعم البدل ہے جو کسی دانا کی قربت یا دوستوں کی رفاقت میں گزارے جاتے ہیں۔کمپیوٹر کی اس ترقی نے بہت سے وجود زندگی سے خالی نہیں کر دیئے؟

بقول شاعر!

چند صفحے دو چار کتابیں سونا گھر اور اور تنہا میں
بند کمرہ ہے چار دیواریں اک بستر اور تنہا میں

بوجھل چہرے روتی آنکھیں لاکھوں لنگڑے اک بیساکھی
کتنے سارے سر ننگے ہیں اک چادر اور تنہا میں

ادیبہ رحمن : S^3H

کرچی کرچی دِل

ایک لمبے عرصے سے میں جس بات کو نظر انداز کر رہی تھی وہ سب میں نے ایک منظر کی صورت میں خواب میں دیکھ لیا۔ آج 14 اگست 2014ء ہے۔ خدا جانے کہ آج ہی مجھے کیوں ایسا خواب دکھانا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ہی جماعت کی چند لڑکیاں مجھے جماعت کی سب سے پچھلی سیٹ پر بٹھانے پر بضد تھیں۔ کسی نے مجھے اپنے ساتھ نہ بیٹھنے دیا اور بالآخر میں جماعت کی سب سے پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں رونے لگی اور ہچکیاں لیتے لیتے میری آنکھ کھل گئی۔ جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں یہ کہانی ہے ہر اُس طالب علم کی جو اپنی زندگی میں کبھی ہار نہیں مانتا۔ یہ کہانی ہے میری۔ یہ کہانی ہے اُس لڑکی کی جس نے حالات سے ہار نہ مانی اور ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی رہی۔

اس کہانی کا آغاز ستمبر کے دوسرے ہفتے میں ہوا جب میری یونیورسٹی کی زندگی کا پہلا دِن تھا۔ میں نے تعلیم ایک ایسے کالج سے حاصل کی تھی جہاں پر ''کوایجوکیشن'' نہیں تھی اور وہاں پڑھتے پڑھتے میں یہ بات بھول گئی کہ سب تعلیمی ادارے ایک سے نہیں ہوتے۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں اپنے سے بہت مختلف طبیعت کے لوگوں میں آ گئی ہوں اور مجھے اب انہیں کے ساتھ چار سال گزارنے تھے۔ چار سال بہت ہوتے ہیں۔ اگر وقت اچھا گزرے تو وقت کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا مگر وقت دشوار سفر جیسا ہو جائے تو لمحہ بھی گِن گِن کر گزارا جاتا ہے۔ خیر پہلے دو ہفتوں میں مَیں نے کسی لڑکے تو کیا کسی لڑکی سے بھی بات نہیں کی۔ وہ اس لئے کہ مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی اپنے سے مختلف بلکہ یوں کہہ لیجئے خلائی مخلوق سے بات کرنے کی۔

وقت گزرتا گیا اور حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ میں دوست بنانے کا موقع اپنی خاموشی کی وجہ سے کھو چکی تھی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں معصوم تھی مگر میں اپنی ہی وجہ سے خود کو کھو رہی تھی۔ میری کلاس میں ایسے لڑکے لڑکیاں بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ علمی میدان میں معرکے مارے اور میرے سوا سب ہی بہت امیر اور بڑے گھروں سے تھے۔ شاید یہی بات تھی جس نے انہیں مغرور بنا رکھا تھا۔

سب لوگ اپنے دوست بنا چکے تھے اور میں اپنے سادہ دِل ہونے کی وجہ سے اکیلی رہ گئی تھی۔ اکیلے رہنے میں کوئی قباحت نہیں مسئلہ یہ ہوا کہ میری کلاس میں سیاست ہونے لگی۔ سیٹ (Seat) پر لڑائیاں ہونے لگیں کہ ادیبہ تم پلیز اگلی سیٹ پر چلی جاؤ یہاں پر میں اپنی دوست کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ Quizzes Assignment اور Projects میں بھی اپنے ہی دوستوں کے ساتھ گروپ بننے لگے۔ میں ایک اوسط درجے کی سٹوڈنٹ تھی اس لئے اعلیٰ درجہ تو کیا مجھ سے کم GPA کے لوگ بھی مجھے اپنے ساتھ گروپ میں رکھنا مناسب نہیں سمجھتے

تھے۔ حسد کلاس میں اس قدر تھا کہ جیسے اِس وقت ہمارے ملک میں دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے۔

ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس نے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ پیار دکھاوے کا تھا اور اندر سے سب ایک دوسرے سے جلتے اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنا چاہتے تھے۔ آگ ہر طرف برابر لگی ہوئی تھی مگر لڑکوں میں کسی حد تک بھائی چارے کی فضا قائم رہی اور لڑکیاں ایک دوسرے کے لئے جال بنتی رہیں۔

آپ نے Outcast کا لفظ تو سنا ہوگا؟ بس میری جماعت والوں نے بھی مجھے میری سادگی اور سادہ لباس کی وجہ سے اپنے سے بہت علیحدہ کر دیا تھا۔ اُن کی گفتگو میری سوچ اور میری پسند سے بہت مختلف ہوتی' اُن کی عادت تھی مجھ سے اپنی باتیں مخفی رکھنا۔ الغرض میں اُن کی کسی سیاست کا حصّہ نہ بن سکی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ سب بُرا تھا یا سب لوگ بُرے تھے مگر ایک بات پکی تھی کہ ''اپنی قسمت ماڑی ہے''۔

مجھے اپنے شروع کے کورسز کی الف' ب بھی نہیں آتی تھی جو کہ میرے لیے ایک اور پریشانی کا سبب تھا۔ میری کلاس میں کچھ لوگ بہت جلد ہمت ہار گئے اور میرے ڈیپارٹمنٹ کو چھوڑ کر یا تو کسی اور سکول چلے گئے یا کچھ یونیورسٹی ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ یونیورسٹی لائف رواں دواں تھی اور میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ میں اپنی والدہ سے پریشانی کا ذکر کرتی تو وہ بھی پریشان ہو جاتی تھیں۔ میں روز رات کو روکر' اپنے غم پہ آنسو بہا کر سو جاتی اور صبح کلاس میں پھر ایک زندہ نعش کی طرح پڑی رہتی۔ نسٹ کے ہاسٹل جیسا میں نے آج تک کوئی ہاسٹل نہیں دیکھا۔ جہاں کبھی پانی' بجلی اور کھانے کی کمی نہیں آتی۔ لڑکیاں کھانے پر بہت نخرے کرتیں مگر مجھے شُکر کر کے کھانا کھانے کی عادت تھی اور مجھے کھانے میں نخرے کرنے والے پسند نہ تھے۔

میں جیسے ہی کلاس لے کر فارغ ہوتی ہاسٹل اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ بہت کم وقت میں نے اپنی کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ گزارا کیونکہ ان کی گفتگو کا موضوع مجھ غریب کی پسند سے بے حد مختلف ہوتا تھا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور میں نے اپنے نسٹ کی Societies کا حصّہ بننا شروع کیا اور بہت جلد میں نے اپنی کھوئی ہوئی پہچان واپس پالی۔

مجھ میں زندگی واپس آنے لگی تھی۔ لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ اِسی دوران میں نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ میرے اندر کی آواز تھی جس نے میری باہر کی خاموشی کو لفظوں میں بیان کرنا چاہا تھا۔ میں ایک ایک لمحہ اِسی سوچ میں گزارتی تھی کہ ایک دِن ایسا بھی آئے گا جب یہ سب بدل جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ مجھے خود کو بدلنا پڑا۔ لوگ میرے عبایہ کے باعث بھی مجھ سے کھچے کھچے سے رہتے تھے اور بہت محتاط طریقے سے مجھ سے گفتگو کرتے اور اکثر کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ مجھے میرے لباس کے باعث کوئی دیہاتی لڑکی سمجھتے تھے۔ عبایہ تو مجھے چھوڑنا پڑا مگر اس سے زیادہ میں اپنی ظاہری صورت کو بدلنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی میں نے اِسے بدلا۔

میرے سکول کے طالب علموں کا رویہ ایسا تھا کہ آپ ایک بار بات کرنے کے بعد ہی سمجھ جائیں کہ وہ اور آپ کسی دو الگ دنیا کے باشندے ہیں۔ لوگ ہمیشہ مجھے کسی اور سکول سے منسوب کر دیتے تھے لیکن مجھے حیرانی نہ ہوتی تھی کیونکہ میری ظاہری صورت' میرا بولنا چالنا بالکل بھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں جیسا نہ تھا۔ جب اچھا وقت شروع ہوا تو میں نے

اپنی یونیورسٹی لائف میں بہت دوست بنائے۔نسٹ کا کوئی ایسا سکول نہیں تھا جہاں مجھے کوئی جاننے والا نہ ہو۔کچھ تو بہت ہی اچھے اور سچے دوست ملے مگر وہ میری جماعت کے نہیں تھے۔ بہت سارے دوستوں کا مل جانا ایک سکون کی بات تھی مگر کلاس میں پھر ایک سی حالت میں وقت گزار دینا کافی تکلیف دہ تھا۔

میں نے نسٹ کی ہر تقریب میں حصّہ لیا۔ جہاں کوئی نہیں پہنچ پاتا تھا میں وہاں موجود ہوتی تھی۔ میں اپنی علمی زندگی میں NCSC ‘NLC ‘NBPK اور کئی Societies کا حصہ بنی۔ وہاں پر بھی کچھ کم سیاست نہ تھی مگر میں نے بہت کچھ سیکھا اور اُس وقت کا کافی لطف اُٹھایا۔

دِل جس تکلیف سے گزرا ہے اُسے شاید لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ پڑھائی سب سے اہم تھی اس لیے میں جب مختلف تقاریب سے واپس کلاس میں لوٹتی تو پھر اسی کشمکش کا شکار ہو جاتی کہ یہ کلاس کب ختم ہوگی اور میں اپنے کمرے میں جاؤں گی۔ بس وقت کے جلدی گزرنے کی دُعا کرتی اور کلاس کے ختم ہوتے ہی دوستوں کے پاس یا پھر ہاسٹل چلی جاتی۔

آخری سال تو بس یہی دُعا کرتے گزرا کہ یہ چوتھا سال بہت جلد ختم ہو جائے کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا لمحہ آتا ہو جب ہماری جماعت کے بچوں کے سر سے دشمنی اور جنگ کی آگ کا بھوت اُترتا ہو۔ سب ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی دوڑ میں تھے اور اس دوڑ میں وہ سب کے احساسات کو کُچل کر آگے نکلنا چاہتے تھے۔

وقت گزر ہی گیا جیسا بھی گزرا مگر میں نے یونیورسٹی کو وقت سے پہلے چھوڑنے کی بجائے، ہمت ہارنے کی بجائے خود کو مضبوط کیا۔ اپنا کھویا ہوا نام اور احساس واپس پا لیا۔ اور اس کہانی کو لکھنے کا مقصد کسی کی دِل آزاری

خدمت کا جذبہ رکھیں

لاتعداد ریسرچ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ وہ لوگ جو اپنے دل میں دوسروں کے لیے خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں وہ زیادہ خوش رہتے ہیں ان لوگوں کے مقابلے میں جو خدمت کرنے سے گریز کرتے ہیں، ڈنمارک میں 43 فیصد لوگ اپنے لوگوں کی بھرپور مدد کرتے ہیں جبکہ 25 فیصد امریکیوں میں بھی یہ جذبہ موجود ہے جب کہ محققین کا کہنا ہے کہ بچوں میں یہ جذبہ کہیں زیادہ ہوتا ہے، دوسروں پر خرچ کرنا اور ان کی خدمت کرنا انسان کی خوشی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

کرنا نہیں بلکہ اِس میں طالب علموں کے لئے ایک سبق ہے کہ کبھی ہار نہ مانو۔ اپنی آزادی کا تقاضا کرو۔ چپ کر کے مت بیٹھ رہو۔ لوگ تمہیں گرانے کی، تمہیں پیچھے کرنے کی، تمہاری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں اُس مقام پر لے جائیں گے جہاں پر تمہیں مایوسی ہی مایوسی دکھائی دے گی۔ مگر تم اپنی ہمت نہ ہارنا اور رُکنا مت۔ چلتے رہنا اور ہمیشہ اپنے آپ کو بہتر بنانے میں ثابت قدم رہنا اور ایک دِن ایسا آئے گا جب تمہارے پاس وہ سب ہوگا جس کی لوگ آرزو کرتے ہیں۔ تم ایک آزاد پرندے کی طرح اُڑ سکو گے جب کوئی تمہارے مقابل نہیں آ سکے گا اور تمہاری ایک پہچان ہوگی۔ اور تم زندگی میں آنے والی ہر دیوار سے ٹکرا جاؤ گے اور میں اپنی آپ بیتی کو اس شعر پر ختم کروں گی۔

تندی بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لئے

مصنف: نصیرالدین گوھر

میموں کے کتے ''دوست''

''چلتے ہو تو چین کو چلئے'' ''نکلے تیری تلاش میں'' اور ان گنت ایسی ہی دوسری کہانیاں یا سفر نامے ہمارے بزرگوں نے ایسے ایسے منظر نامے پیش کیے ہیں کہ انسان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ بہت سوچنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ کہیں ایسی جگہ جانا چاہئے جہاں واقعی کچھ مختلف ہو۔ امریکہ؟ نہیں وہاں کولمبس اور اس کے پیروکاروں نے بہت گند ڈال دیا ہے۔ آسٹریلیا؟ نہیں وہاں بھی اُسی قماش کے لوگ آباد ہیں۔ یورپ' انگلینڈ' سکاٹ لینڈ' ویلز سب دیکھ چکے تھے۔ وہاں ہمارے پُرانے آقا اب تو دیسی لوگوں کی ڈرائیوری کر رہے ہیں۔ لہٰذا نہیں۔ تو پھر کہاں؟ اٹلی کو قرعہء فال سے اِس لیے نکال دیا کہ پاکستان سے پاکستان جانے کا فائدہ؟ ناروے' سویڈن' فن لینڈ اور ڈنمارک وغیرہ سارے پہلے دیکھ چکے تھے تو پھر؟۔۔۔۔ یاد آیا پہلی دفعہ سٹاک ہوم میں صرف ویک اینڈ گزارہ تھا اور وہ بھی 20-22 سال پہلے۔ کیوں نہ اس دفعہ کا سمر کیمپ وہاں لگایا جائے لہٰذا کوشش کرنے لگے کوئی راہ نکالنے کی۔ شکر خورہ شکر چاہے اور خدا نہ دے۔ یہ تو ہو سکتا نہیں کہ ایک محاورہ غلط ثابت ہو جائے اور ہمارے بزرگوں کی توہین کا موجب بنے لہٰذا اللہ نے ایسا سبب پیدا کیا کہ جون میں ہی ہمیں سویڈن کے خواب آنے لگے۔ گھر والوں سے چھپ چھپ کر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار دیکھا۔ قیامت کے آثار تو نظر نہیں آئے البتہ آنکھوں میں چمک ضرور پیدا ہونی شروع ہو چکی تھی۔ ''دِنو ادِنوا میں گنوں کب جائیں گے سٹاک ہوم'' کا گیت گاتے گاتے وہ دِن آ پہنچا جب رات کے سوا دو بجے ہماری فلائٹ تھی سٹاک ہوم کے لئے براستہ دوہا۔

سٹاک ہوم آر لانڈا ائیر پورٹ پر اترنے کے بعد کئی لوگوں سے (بلا تخصیص جنس) دِل ہی دِل میں ہاتھ ملانے اور معانقہ وغیرہ کرتے ہوئے ہم اپنے میزبان کے ساتھ سٹاک ہوم والی بس میں سوار ہو چکے تھے۔ چچا مستنصر حسین کے سفر ناموں کی کہانیاں اور ان کے کرداروں سے متاثرہ ہمارا ذہن پتہ نہیں کِس ادھیڑ بُن میں مصروف تھا کہ اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی گوری پر نظر پڑی۔ یہ ہماری نظروں کا دھوکہ تھا کہ ہمارے ذہن میں نقش شدہ مناظر کا اثر یوں لگا کہ گوری کیسی گوری ہے کہ آدھی کالی ہے۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کوئی چیز اسے لپٹے ہوئے ہے۔ یہ کیا ہے بھئی؟ ساتھ والی سیٹ جب خالی ہے تو بوائے فرینڈ وہاں کیوں نہیں بیٹھتا۔ لیکن یہ تو عجیب وغریب چیز تھی جو اپنے ساتھی کا منہ چاٹنے کے ساتھ ساتھ اس سے جواباً بھرپور پیار بھی لے رہی تھی۔ ''یہاں گوریاں اپنے بوائے فرینڈ سے زیادہ اپنے Pets اور خصوصاً کتوں سے پیار کرتی ہیں'' ہمارا ساتھی ہمیں بتا رہا تھا۔ اِس اچانک اور بے وقت آواز پر ہم بیدار ہو چکے تھے اور اپنی عینک (جو کہ دور والی تھی) بدل کر دیکھا تو سامنے سیٹ پر ایک سیاہ فام عورت سفید سکارف لیے بیٹھی تھی۔ اپنے

پراگندہ ذہن پر سو دفعہ لعنت بھیجنے کے بعد ہم اب اپنے ساتھی سے سٹاک ہوم کے بارے میں دوسری انفارمیشن لے رہے تھے۔ یونیورسٹی جہاں ہمارا دفتر تھا وہاں سے' متصلہ ایک بہت بڑی مارکیٹ Kista Galleria میں واقع ایک اپارٹمنٹ میں چند روز گزارنے کے بعد ہم ایک اور علاقے میں واقع ایک ہوٹل کے بڑے سے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو رہے تھے جو ہمارے دفتر سے 3-2 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے روزانہ صبح وشام پیدل آنا جانا ایک معمول سا بنتا جا رہا تھا لیکن احتیاطاً ایک SL CARD بنوالیا کہ سٹاک ہوم میں سفر کرنے کے لئے آسانی ہو جائے۔ اِس کارڈ کی بدولت دِن ہو یا رات جب چاہیں بس اور ریل پر سٹاک ہوم کے اندر واقع کِسی بھی جگہ بلا روک ٹوک جا سکتے تھے۔

آج کا یہ ماڈرن ابنِ بطوطا اپنے سفر کے لئے اب آزاد تھا۔ جدھر دِل چاہا اور جب چاہا منہ ہاتھ حتیٰ کہ نہائے بغیر نکل کھڑے ہونے سے ہمیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ یورپ میں بیوی بچوں کے ساتھ سیر وتفریح کے لئے جانا نری بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے؟ اپنے علاوہ دوسروں کے اخلاقِ حمیدہ خراب کرنے کا پروانہ ہرگز کسی کو نہیں ملنا چاہیے اور ہم اِس اصول پر سختی سے کاربند ہیں اور رہنا چاہیں گے کِسی کو تکلیف ہو تو ہو۔ ہمارے اصول ہمیں ایسے ہی پیارے ہیں جیسے بیوی بچے لہٰذا کِسی کو بھی خراب نہیں کیا جا سکتا۔

پہلا دِن تھا ہمارا ہوٹل کے کمرے میں۔ سوچا کہیں کل صبح دفتر کے لئے لیٹ نہ ہو جائیں لہٰذا کیوں نہ ایک عدد آزمائشی سفر ''ریہرسل'' کے طور پر کر لیا جائے۔ ہوٹل سے نِکل کر ہم KISTA کی طرف جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ بنی پگ ڈنڈی پر چل پڑے۔ ایک عدد (نہایت ہی) گوری خاتون اپنے ساتھ اپنے پالتو کتے کو پٹے سے پکڑے شاملِ سفر ہو چکی تھی۔ یہ کتا بھی کیا کتا تھا منہ سے اگر شیر لگتا تھا تو دُم سے گینڈا اور کمر سے چیتا۔ دِل ہی دِل میں سوچا کہ واہ مولا کیا مقدر بنایا ہے تو نے؟ ۔۔۔۔ اپنا نہیں گوری کے کتے کا!! گلے میں اگر نائیلون کا پٹہ ہے تو کیا ہوا اِس ایک عدد قباحت کے علاوہ اور کیا کیا نہیں کر سکتا یا اُسے کیا نہیں ملتا جو ہم اشرف المخلوق ہو کر حاصل کرتے ہیں وہ بھی سو تردد کرنے کے بعد ۔۔۔۔ بڑی مشکل سے اِس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور یہ سوچا کہ گوری کو کتے کے ساتھ کراس کرنا ہے تو کیسے؟ ایک دفعہ تو جسم پر لرزا طاری ہوا کہ اگر کتا واقعی کتا نِکلا تو ہماری تکہ بوٹی ہونے سے کون بچائے گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنی اچھی مالکن کو چھوڑ کر کتا ہماری طرف دھیان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ذرا پیچھے پیچھے چلتے ہم کبھی گوری اور کبھی اس کے ساتھ کتے کو دیکھ رہے تھے۔ ۔۔ایسی ہوشربا اور مست چال ۔۔۔ واللہ ہم نے آج تک اپنے ہاں کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اور ہو بھی کیسے سکتی؟ ہمارے ہاں تو پیدل چلنا بھی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے ورزش تو ایک طرف۔ اور اوپر سے مشرقی لباس ہمارے ہر عیب کو ڈھانپ لیتا ہے کِسی خوبی کو وہ اجاگر کیونکر ہونے دیگا؟ کتے نے ہلکی سی آواز کیا نکالی کہ جیسے گوری کے پاؤں میں بیڑی پڑ گئی۔ فوراً کتے کو پچکارنا شروع کیا۔ موقع غنیمت جان کر ہم چپکے سے گزرنے لگے تو میم صاحبہ اپنے کتے کو ایک طرف لے جانے لگی۔ مجال ہے کتے نے ہمیں قابلِ التفات سمجھا ہو۔ ذرا سی دور جا کر تجسس کے طور پر پیچھے پلٹ کے دیکھا تو کتا رفع ءِ حاجت سے فارغ ہو چکا تھا اور میم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کے وارے جا رہی تھی۔ ذرا غور کریں ہمارے ہاں کسی بچے نے اپنی ماں سے بظاہر ایسی کِسی خواہش کا اظہار یوں برسرِ راہ کیا ہوتا تو ماں کی تقریر شنیدنی ہوتی بہرحال بیس پچیس منٹ میں ہم اپنی یونیورسٹی تک پہنچ کر ہوٹل واپسی

کا سفر شروع کر چکے تھے۔ راستے میں کئی پگ ڈنڈیاں آپس میں ملتی بچھڑتی رہتی ہیں یہ ساری پگ ڈنڈیاں واقعی پکی تھیں اور ارد گرد گھنا سرسبز جنگل اُگا ہوا ہے۔ ساتھ چلتی سڑک پر ٹریفک کا شور آپ کو شہری زندگی کا احساس دلاتا رہتا ہے ورنہ جنگل میں تو شاذ و نادر ہی کوئی پرندہ نظر آتا ہے۔ جنگل میں دوسری طرف رہائشی عمارتیں ہیں۔ شہر کے مکین خاموشی سے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مجال ہے کوئی شور شرابا ہو۔ حالانکہ بسوں اور کاروں کی کمی تو یہاں نہیں ہے۔ ہارن کا استعمال اتنا کم ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہارن بجانے پر شائد گورنمنٹ نے جرمانہ رکھا ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ دس منٹ کے سفر میں کوئی نہ ملا تو درمیان میں پہنچ کر ہماری سرراہ ملاقات دو اور لوگوں سے ہوتی ہے۔ ایک ریڈ ہیڈ میم اپنے عجیب و غریب نیولا نما کتے یا کتیا (جنس کا تعین ذرا مشکل تھا کہ اتنا ٹائم نہیں تھا) کے ساتھ اپنی ایک اور بلونڈ ساتھی کے ساتھ کھڑے بُل ٹیریئر کتے سے ہم کلام تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے کتوں سے یوں پیار کر رہی تھیں کہ ہمیں رشک سا آنے لگا۔ کاش ہمارے نصیب میں یوں کچھ لکھا ہوتا۔ ہمارے کتے اتنے بدنصیب سہی ہم کون سا اتنے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ بہر حال اِن کتوں کا اپنے پطرس بخاری صاحب کے شاعر کتوں سے دور دور تک واسطہ نہیں لگتا ہے۔ جب کسی کو اتنا پیار مل رہا ہو تو اُسے بھونک بھونک کر توجہ طلب کرنے کی کیا ضرورت۔ قریب سے گزرے تو یوں لگا جیسے دونوں کتے آنکھیں موندھے کسی اور ہی دنیا میں تھے اور دونوں عورتیں ایک دوسرے کے کتوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے باہم مبارک باد دے رہی ہوں۔ بعد میں کتا ایکسچینج کا پروگرام بن جائے تو کوئی بعید نہیں۔۔۔ کونسا خاوند (ہاں کونسا خاوند) بدلنے کی بات ہو جاتی۔۔۔ نئے نئے ٹرینڈ یہاں جنم لیتے رہتے ہیں۔ حظِ اٹھانے میں راہِ اختراج کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نئی نئی ایجادیں' اُن ملکوں میں شائد ایسے ہی کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ہمارے اہلِ علم خصوصاً علماء حضرات کو اِس بات کی شرعی حیثیت کا تعین کرنے کے بعد کوئی فتوی ضرور دینا چاہیے ورنہ ہماری پسماندگی اور ذہنی غیر آسودگی میں اضافہ ہوتا رہنے کے امکانات بڑھتے رہیں گے۔ اِس بات کے علاوہ ایک اور بات ہمارے علماء کے لئے قابلِ فکر ہو سکتی ہے کہ۔ سنتے آئے ہیں کہ۔ ''جس گھر میں کتا ہو اُس گھر میں فرشتے نہیں آتے'' تو ان لوگوں نے کہیں اسی بات کو مدِ نظر رکھ کر تو نہیں ہر گھر میں کم از کم ایک عدد کتا پال رکھا کہ نہ فرشتے آئیں نہ گناہ (اگر وہ کوئی گناہ چھپ کر کرتے ہوں؟ ویسے تو مجھے یقین ہے ہم سے کم ہی کرتے ہوں گے وہ جو کرتے ہیں کھلے عام کرتے ہیں) یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر کے وہاں جنت کی لائن میں بھی ہم سب سے آگے ہوں۔ اگر یہ فرشتے رحمت ہی کے ہیں' منکر نکیر نہیں' تو پھر بھی جو رحمتیں مسلمان گھروں پر نازل ہو رہی ہیں وہ ماضی میں صومالیہ اور ایتھوپیا سے لے کر برما کے مسلمانوں تک تو نظر آ رہی تھیں اب حال ہی میں عراق' افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں پر بھی نازل ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ نعوذ باللہ' ہم مذہب سے انکاری ہرگز نہیں لیکن جاہل مولویوں کے ہاتھوں قرآن و حدیث کی غلط تشریح پر تو اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہر حال ہمارے دِن یہاں اپنے کام کے سلسلے میں یوں بیت رہے تھے کہ بس قیامت کی نشانی کے طور پر' تھوڑی بہت جو فرصت ملی اُس میں ہمارا یہاں کا انسانی اور حیوانی مطالعہ جاری رہا اور پھر ایک دن ہم اپنے دو دوستوں کے ساتھ نوبیل میوزیم دیکھنے سٹاک ہوم سینٹر کی طرف روانہ

ہوئے۔سینٹرل سٹاک ہوم کی گلیاں ہمارے چک جھمرے کی گلیوں سے ملتی جلتی تھیں۔گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں ہمارے چک جھمرے والے دروازوں کی کوالٹی ورک سے گھٹیا تو ہو سکتے ہیں بڑھیا نہیں ہو سکتے البتہ صفائی بہتر تھی۔چند ایک اینٹوں سے بنی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم نوبیل میوزیم کے سامنے کھڑے تھے۔وہ میوزیم جہاں دنیا بھر کے سائنس دانوں کے کارنامے محفوظ ہیں اور اِن کی تصاویر اور ریسرچ کے چیدہ چیدہ حصے اور Audio-Video فلمیں حاضرین دیکھ اور سن سکتے ہیں۔دو تین گھنٹے میوزیم میں گزار کر ہم باہر آ کر تھوڑی دیر ستانے کے لئے بڑے سے احاطے میں لگے ایک لکڑی کے بینچ پر بیٹھے تھے۔سیاحوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔دنیا بھر سے پتہ نہیں کہاں کہاں سے مرد و خواتین طرح طرح کے ڈریسز میں ملبوس بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک بینچ پر بیٹھی میم آئس کریم کھا رہی تھی۔ہمارے خیال میں وہ خود کم کھا رہی تھی جتنی اپنے نہایت صاف ستھرے کتے (پھر کتے کی جنس اتنی اہم نہیں جتنی شکل وصورت اور وہ بھی نہایت سلیقے سے تراشیدہ صفائی ستھرائی کے ساتھ کتے یا کتیا کا قد کاٹھ قابلِ دید تھا سارے جسم پر سفید بال وہ بھی نہایت سلیقے سے تراشیدہ ایسے جیسے اون کے خوبصورت لچھے۔۔۔ہماری تو پالتو بھیڑیں بھی ایسی صاف نہیں ہوتیں۔) کو چٹا رہی تھی۔میرے دونوں ساتھی نوجوان ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے تھے۔خیر زبان تو یہاں بھی کئی دفعہ ہونٹوں پر پھیری مگر صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔جتنی دیر ہمارا وہاں بیٹھنے کا ارادہ تھا اِس منظر کے بعد (حسد کہہ لیں یا رشک ویسے بھی دونوں میں کونسا زیادہ فرق ہے) مختصر ہو کر ہمیں بازار میں لے آیا تھا۔چلتے چلتے ہم ایک ریسٹورنٹ پر آ پہنچے جو سمندر (سٹاک ہوم کے بیچوں بیچ سمندر اِدھر اُدھر خلیج کی طرح گُھسا ہوا ہے) کے کنارے واقع تھا۔ہمارے ایک ساتھی سے رہا نہ گیا اور ہم نے وہی آئس کریم انجوائے کی جو وہ وہاں میم اپنے ساتھی کتے کو چٹا رہی تھی لیکن بعد میں تبصرے سے ثابت ہوا کہ آئس کریم اتنی مزے دار نہیں لگی تھی ہمارے دونوں پاکستانی ساتھیوں کو۔اب میں کیسے سمجھاتا؟ میم کے گورے ہاتھ کہاں سے میسر ہوتے جو آئس کریم کا مزہ دوبالا کرتے۔۔۔ویسے بھی یہ تقاضائے عمر مجھے منہ بند رکھنے ہی میں تہذیب کی بات محسوس ہوئی تھی۔

لیجئے ایک اور ویک اینڈ آ پہنچا۔کچھ پاکستانی دوستوں نے بیچ پر پکنک منانے کا پروگرام بنا رکھا تھا' ظاہر ہے ہم مہمانِ خصوصی تھے۔گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم اِس چھوٹے سے مصنوعی ریتلے ساحل (سٹاک ہوم میں زیادہ تر Rocky Beach ہی ہیں) پر پہنچ کر اپنا پکنک کا سامان اٹھائے ایک طرف سے داخل ہو رہے تھے۔جس طرح کے بیچ ہم اپنی جوانی میں دیکھ چکے تھے اِسے دیکھ کر ہمارے ادھیڑ پنے کو زیادہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔پھر بھی ہم نے بیچ میوزک اپنے موبائل پر لگا کر مزا لینے کی اپنی سی کوشش کی۔اِک عدد سپاٹ چن کر ہم نے باربی کیو شروع کر دیا تھا۔اِس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے ساحل پر۔ایک طرف چند ایک فیملیاں اپنے اپنے بستر بچھا کے اوندھے لیٹے جسموں کو Tan کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔تکہ اور سیخ کباب پک کر تیار ہونے لگے اور گرم گرم نانوں کے ساتھ ہم نے انجوائے کرنے شروع کر دیے تھے۔تھوڑی دور ایک میم اپنے بستر نما گدے پر لیٹی ہوئی تھی اور پاس ہی اس کا کتا اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا۔اجنبی لوگوں کو دیکھ کر بھی نہ بھونکنے کی جیسے قسم اُٹھا رکھی ہو۔یہ تھی وہ خصلت جو وہاں کے کتوں کو ہمارے کتوں سے ممتاز کرتی ہے۔کتا اپنی میم کی خوشبو کا جتنا عادی تھا اس

وجہ سے جتنی دیر صبر کر سکتا تھا کیا مگر فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تھوڑی دیر بعد وہ ہمارے پاس آ ہی گیا ہمارے نوجوان ساتھیوں میں جوش وخروش کی ایک لہر سی دوڑ گئی کہ لو اب تو بیچ پر آنے کی قیمت پوری ہو کر رہے گی لیکن وائے قسمت۔۔۔ کتا سیخ کباب لکڑی سمیت کھا کر واپس جا رہا تھا۔۔۔ لوگ جو میم کا انتظار کر رہے تھے کتے کے پیچھے پیچھے آنے کا۔ وہ تو اک طرف دھرا کا دھرا رہ گیا اوپر سے پریشانی لاحق ہوگئی اگر کتے کو کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ پیشترِ اِس کے کہ کتا میم کے لئے وجہ تشویش بنتا ہم اپنی پکنک مختصر کر کے جلدی جلدی بوریا بستر سمیٹے واپس سٹاک ہوم یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئے۔۔۔ پرائے دیس میں آدمی وہ بھی چھڑا' کتے سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ دھوبی کا کتا جو نہ گھر کا نہ گھاٹ (بیچ) کا۔ للچاتی زبان منہ کے اندر رکھنے میں ہی ہمیں بھلائی زیادہ معلوم ہوئی ورنہ اپنے کام سے بھی جانے کا احتمال تھا۔ ہمارے سمر کیمپ کے خاتمے سے ہفتہ پہلے ہمارے ایک دوست نے بذریعہ بحری جہاز فن لینڈ جانے کا پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔ ''بہت مزا آئے گا سر۔۔۔ آپ جہاز کو جب مختلف چھوٹے چھوٹے جزائر کے بیچوں بیچ جاتے ہوئے دیکھیں گے''۔ ہمارے خواب فلم ٹائی ٹینک سے متاثر ہوتے لگ رہے تھے۔ کئی دفعہ نیند میں ہم بستر پر سے بازو پھیلائے نیچے گرتے گرتے بچے۔۔ پر کیا کریں اتنی لمبی جدائی بھی ظلم ڈھا رہی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ پہنچا جس دن کی بکنگ کروا رکھی تھی۔ بذریعہ انڈر گراؤنڈ ٹرین سلوسن سٹیشن پہنچ کر بھاگم بھاگ مطلوبہ فیری پورٹ پر پہنچے۔۔۔ ٹکٹ لے کر اوپر آ کر جہاز میں سوار ہونے کے لئے روانگی لاؤنج میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔۔ چیکنگ نہ ہونے کے برابر تھی البتہ سیکورٹی والے سدھائے ہوئے کتے لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پتہ نہیں کیا ہوا ایک طرف تھوڑی ہل چل محسوس ہوئی۔ کوئی اناؤسمنٹ نہیں ہو رہی تھی اگرچہ روانگی کا وقت ہوئے جا رہا تھا۔ لوگوں کی دبی دبی ہنسی سن کر اُدھر متوجہ ہوئے جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ سیکورٹی والوں کے سدھائے ہوئے کتے کسی میم کے ساتھ آئی خوبصورت کتیا کو سدھانا مانگ رہے تھے۔ سیکورٹی والے انہیں سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ اچھا خاصا تماشا بن چکا تھا۔ مجال ہے میم یا اس کی کتیا نے کوئی احتجاج کیا ہو۔ خدا خدا کر کے سیکورٹی سٹاف نے اپنی قمیضیں اُتار کر اپنے پالتو کتوں کو کسی حد تک اپنے قابو میں کرنے کی کامیاب کوشش کی تو ہم واپس اپنی سیٹوں پر پہنچے۔ پر کیا ہوا کہ اِن چند منٹوں کی افراتفری میں ہماری کشتی چھوٹ چکی تھی۔۔۔ لیجئے صاحبو۔ ہمارے سارے سہانے خواب اِک ''کتیا نہ ہل چل'' کی نظر ہو کر چکنا چور ہو چکے تھے۔۔۔ انفارمیشن والوں سے پتہ چلا کشتیاں اگلے چند روز تک فلی بکڈ ہیں اور پھر ہماری پاکستان واپسی بھی سر پر آن پہنچی تھی۔

پاگل خانہ

ایک مرتبہ برطانوی وزیراعظم چرچل ایک پاگل خانے کے دورے پر گئے' جیسے ہی پاگل خانے کے مرکزی دوازے سے اندر جانے لگے تو ایک پاگل صحتمند ہونے کے بعد گھر جانے کے لئے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے چرچل نے کہا: ''مجھ سے ملو میں برطانیہ کا وزیراعظم ہوں'' اس نے چرچل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''فکر نہ کرو جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے' میں جب یہاں آیا تھا تو میں بھی یہی کہتا تھا۔''

کمال مصطفیٰ' نسٹ سینٹر فار انرجی سسٹمز

ہاسٹل بیتیاں

تندرستی ہزار نعمت ہے' یہ فقرہ ہم نے اپنی نوعمری میں سُنا اور آج تک اپنی صحت کی بہتری کے حوالے سے جو کچھ بن پڑا وہ کیا۔ اگرچہ ہماری ظاہری حالت اس دعوے کے بالکل برعکس ہے لیکن پھر بھی ہم اپنے بیان پر ڈٹے ہوئے ہیں اور ہمارے جوشِ خطابت کا عملی مظاہرہ ہے۔ اپنے بڑوں سے سُن رکھا تھا کہ اچھی صحت کے لیے صبح سویرے اُٹھنا اور ناشتہ کرنا انتہائی اہم ہے۔ اس نصیحت پر ہم نے پوری زندگی عمل کیا اور بھرپور کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ صبح کی اذان کے لیے بارہا ہم نے مُرغے میاں کو جگایا تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں۔ بہرحال رفتہ رفتہ زمانہ تبدیل ہوا اور حالات نے ہمیں یونیورسٹی کی رنگینیوں سے آشنا کیا۔ یہاں آ کر ہماری زندگی میں ایک منفرد انقلاب برپا ہوا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ رات کو جلدی سونا' علی الصبح جاگنا' سب دیوانے کے خواب ہیں۔ اپنے بستر سے ایسے مانوس ہوئے کہ الارم تو درکنار کوئی ہمارے سرہانے توپ لے کر بھی کھڑا ہو جائے تو مجال ہے کہ کروٹ بھی بدلیں۔ صرف اس ایک عادت نے ہماری صحت پر کافی منفی اثرات مرتب کیے اور تب ہمیں اپنے بڑوں کی وہ تمام نصیحتیں یاد آنے لگیں۔ اس احساسِ ندامت کے باعث ہم نے فیصلہ کیا کہ آنے والی صبح تبدیلی کی صبح ہوگی (یقین جانئے ہماری اس سوچ کی تبدیلی میں کوئی سیاسی گروہ ملوث نہیں)۔

اس پختہ اور مصمم ارادے کے ساتھ اگلی صبح اُٹھے مگر اس وقت جبکہ مَیس کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے وہاں کھڑے کھڑے کھانوں کی فہرست کا جائزہ لیا اور دل ہی دل میں ملامت کرنے لگے کہ آج تک کیسی کیسی بیش بہا نعمتوں سے اپنی زبان کو محروم رکھا۔ پُوریاں' پراٹھے' تازہ دہی اور نجانے کیا کیا۔ اسی احساسِ محرومی کے ساتھ وہاں سے چلتے بنے اور ارادہ کر لیا کہ آئندہ کم از کم ہوسٹل میں رہتے ہوئے کبھی ناشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ خدا کی لاٹھی بھی بڑی بے آواز ہے۔ ہم جو اتنے عرصے سے اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتے چلے آ رہے تھے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری آنکھ ہمیشہ اس روز کھلتی جب ناشتے میں ڈبل روٹی' مکھن اور چائے ہوتی۔ خیر اسے بھی ہم نے حکمت پر ور جانا اور اس بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔

صحت اور لذت سے بھرپور اس ناشتے نے ہماری صحت پر جو اثرات مرتب کیے وہ تو فی الوقت موضوعِ بحث نہیں لیکن اس کی وجہ سے مشاہدے کا ایسا موقع ملا جو آج تک میسر نہیں آیا۔ لوگوں کی حرکات و سکنات اور گردوپیش میں وقوع پذیر ہونے والے حالات نے ہماری نفسیات پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ یہاں آ کر یہ احساس بھی دل میں جنم لینے لگا' ہنسنا ہنسانا ہماری زندگی کا حصہ نہیں۔ یہ احساس ان سازشی اذہان کا نتیجہ تھا کہ جن کے خیال میں ناشتے میں ڈبل روٹی کا استعمال کسی یہودی سازش سے کم نہیں اور یہ

دشمنان اسلام و پاکستان کی ہمارے خلاف بہت ساری مہمات میں سے ایک مہم ہے۔ یہ گروہ ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے ان تمام زندگی سے بیزار بابوں پر مشتمل تھا جن کے خیال میں یونیورسٹی کا کل حدود اربعہ صرف کلاس اور ہوسٹل پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ کر یہ لوگ طویل سیاسی تبصرے، ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر بحثیں، علمی جائزے یہاں تک کہ گھریلو معاملات پر بات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

الیکشن، قومی سلامتی کے امور، تیل اور گیس کی بڑھتی ہوئی قیمتیں، یہ وہ تمام پہلو تھے جن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے روشنی ڈالی جاتی تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے ہم جیسے عامیانہ سوچ کے مالکان ان بابوں کو رشک بھری نگاہوں سے تکتے اور دل ہی دل میں انہیں رول ماڈل بنا لیتے۔ چونکہ یہ لوگ تعلیمی حوالے سے بھی نہایت حساس واقع ہوئے تھے چنانچہ اپنے مقالہ جات کے حوالے سے تمام تر نئی ایجادات، پیچیدہ تکنیکی معاملات اور علمی موشگافیوں سے ٹیبل پر بیٹھے ہوئے کمسن اذہان کو باور کروا دیتے کہ اعلیٰ تعلیم کا حصول بچوں کا کھیل نہیں۔ ان کی ظاہری حالت سونے پہ سہاگے کا کام کرتی اور ہمیں خوفزدہ کرنے کا بھرپور سامان فراہم کرتی۔ بڑھے ہوئے بال، بے رونق اُجڑے ہوئے چہرے جن پر مایوسی کے نشان صاف ظاہر ہوتے تھے، بوسیدہ کپڑے اور تھکے ہوئے جسم۔۔۔ ہمیں آہستہ آہستہ یقین ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہم بھی بالآخر یونیورسٹی سے پاگل خانے داخل کروا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ہم نے فوراً چائے ختم کی اور واپس جا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ جس نے نیند جیسی نعمت عطا کی۔

مولانا رومؒ

- ☆ تم پانی جیسے بنو جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ پتھر جیسے نہ بنو جو دوسروں کا راستہ بھی روک لیتا ہے۔
- ☆ مت رکھ اُمید کسی سے مگر اپنے رب سے، اور مت ڈر کسی سے مگر اپنے گناہ سے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- ☆ اپنی آواز کی بجائے اپنے دلائل کو بلند کیجئے۔ پھول بادل کے گرجنے سے نہیں برسنے سے اُگتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ

- ☆ اولاد کے لیے جو بھی چیز لاؤ سب سے پہلے بیٹی کو دو۔
- ☆ اگر تو بیکار پتھر ہے تو کسی صاحبِ علم کے پاس بیٹھ گوہر بن جائے گا۔ (مولانا روم)
- ☆ ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک احمق کے با اختیار بن جانے سے ہوتا ہے۔ (مولانا روم)
- ☆ جو شخص بچپن میں تمیز نہیں سیکھتا بڑا ہو کر بھی نہیں سیکھتا۔

عبدالجبار خان: فیکلٹی سپانسر' بزمِ پاکستان

سی این جی کی قطار

مشینوں کی ترقی جذبات کی موت ہے اس سے ملتا جلتا مصرع علامہ اقبال کی شاعری کے سرسری مطالعے کے دوران نظر سے گزرا۔ بچپن میں اماں، ابا کی لڑائی کے دوران ابا کو اماں کی چیخ و پکار سے بے پروا کان سے ریڈیو لگائے دیکھا۔ گویا یہ لڑائی کے دوران ذرا مٹھی بھر کی پناہ گاہ تھی۔ ابا کا ریڈیو سے انس اس وقت ابھر آتا تھا جب وہ حکم فرماتے تھے کہ ''خبردار اب کوئی آواز نہ آئے کہ اب خبروں کا وقت ہے'' اور بی بی سی کے میوزک سے پورا گھر گونج اٹھتا خیر اس کے بعد اماں کی جونئ سوکن گھر میں داخل ہوئی تو وہ ٹی وی تھا جس نے اماں اور ابا کے درمیان مزید دوریاں بڑھا دیں۔ ہاں بہر حال ہم بچے کبھی مونگ پھلیاں اور کبھی پاپ کارن اور کبھی خالی ہاتھ بند منہ' مسٹر چپس دیکھا کرتے تھے اور اس سے ہماری اپنے بہن بھائیوں سے ملاقات ضرور ہو جایا کرتی تھی اور یہی ہماری ہم عمر نسل کی بیٹھک ہوا کرتی تھی ورنہ ہمارے بزرگ ہمیں بیٹھک کے بارے میں بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے جہاں چار پائیوں کے درمیان آگ کا الاؤ جلا کر حقوں کے بڑے بڑے کش لگائے جاتے تھے اور ان کے دھوئیں کے سائے میں دنیا جہاں کی باتیں اور تبصرے ہوتے۔ مطلب ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی سے لیکر محلے کی مسجد کے قاری صاحب کی پگڑی کے رنگ تک کا جائزہ لیا جاتا۔

لیکن ہم جیسی جنریشن بھلا ان چیزوں سے کہاں واقف کہ موبائل کی ایجاد اور اس کی ترقی اور ہر نیٹ ورک کے حیرت انگیز پیکجز نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے اور ہم خط کے لکھے جانے اس کے جواب کے انتظار اور پھر اس کے پڑھنے کے مزے سے کُلّی نا آشنا صرف ایک کال یا میسج تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسی طرح انٹرنیٹ کی ترقی' فیس بک اور ٹوئٹر کی ایجاد سے تو ہمیں بالکل اپنے کمروں بلکہ اپنے اپنے کمبلوں تک ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں اب تو نوکر سے کھانا بھی کمرے میں اس کی وال پر سٹیٹس اپ ڈیٹ کر کے یا اُسے ٹویٹ کر کے منگوایا جاتا ہے غرض اب کچھ بھی لینا ہو یا منگوانا ہو تو ہر چیز کی ویب سائٹ موجود ہے لیکن ان تمام آسائشوں کی موجودگی نے ماں باپ کو بچوں سے ایک ہمسائے کو دوسرے سے اور دوستوں کو بالکل تنہا کر دیا ہے اور انسان اپنی وال پر موجود پانچ سو فرینڈز کے باوجود خوشی اور غمی کے وقت بالکل اکیلا ہوتا ہے۔

یہ کم بخت سی این جی لائن کا سوشل میڈیا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور اس سے بچنے کا واحد طریقہ ہے کہ آپ اپنا نیٹ ورک پٹرول پر منتقل کر لیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پٹرول کی آسمان کو چھوتی قیمتیں اور اس کی کم مائلج آپ کو ایسا نہیں کرنے دے گی اور آپ بھی مجبوراً اس نیٹ ورک کا حصہ بن جائیں گے۔

اسی طرح دوسرے سوشل نیٹ ورک میں تو آپ کو دعوت دی جاتی ہے جبکہ اس نیٹ ورک کا آپ خود لائن میں لگ کر حصہ بنتے ہیں اور پھر بہت ساری باتیں' تصویریں' لطیفے' قصے اور دانائی کی چیزیں آپ کی ذہنی وال پر

پوسٹ ہو جاتے ہیں اور آپ کو ایک ٹیکسی والے سے لے کر بزنس مین تک کی سوچ کا مجبوراً سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لائن میں لگنے کے بعد جب آپ اپنے موبائل سے خوامخواہ کھیل رہے ہونگے یا اپنی گاڑی کا ریڈیو ٹیون کر رہے ہونگے تو اچانک ایک صاحب کی آواز آپکے کانوں سے ٹکرائے گی اور آپ کی توجہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف ہو جائے گی۔ اور وہ صاحب اپنی عوام کی حالت اس طرح بیان کر رہے ہونگے کہ ایک بادشاہ تھا جو کہ بہت ظالم تھا اور اپنی عوام پر بہت سختی اور ظلم کرتا تھا لیکن چاہتا تھا کہ عوام بے بس ہو کر اس کے پاس آئے اور گڑگڑا کر اس کے سامنے فریاد کرے اور وہ اس فریادی منظر سے لطف اندوز ہو سکے لیکن اس کی عوام بہت صابر اور خوددار تھی اور کبھی نہ اس بادشاہ کی برائی کی نہ ہی فریاد۔ یہاں تک کہ عوام کے اس رویہ سے وہ بادشاہ خود بلڈ پریشر کا مریض بن گیا اور ہر وقت پریشان رہنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کا وزیر بہت پریشان ہوا اور اس کو مشورہ دیا کہ جب عوام صبح اٹھ کر اپنے کام کو جاتی ہے تو اسے دس دس جوتے لگائے جائیں اور پھر انھیں کام پر بھیجا جائے تو عوام تلملا اٹھے گی اور فوراً فریاد کو دوڑے گی۔ بادشاہ کو اپنے وزیر کی یہ تجویز بہت بھلی لگی اور اس نے اس کار خیر کا حکم دے دیا۔ جیسے ہی اس پر عمل شروع ہوا عوام دوسرے دن ہی بادشاہ کے پاس دوڑی اور فریادی طبل بجنے لگا۔ اس صورت حال سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور بڑے فخریہ انداز میں دربار لگایا گیا اور بڑی عزت کے ساتھ عوام کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور فریاد سنانے کا کہا گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ عوام نے بادشاہ کے ظلم کی شکایت کرنے کی بجائے یہ التجا کی کہ جوتے مارنے والے سٹاف میں اضافہ کیا جائے تا کہ وہ جلدی سے اپنے اپنے کام کو جا سکیں اور لیٹ نہ ہوں عوام کے اس صبر کا وہ بادشاہ متحمل نہ ہو سکا اور اسے ہارٹ

> حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مناظرہ ہوا' تو حضرت موسیٰ نے فرمایا: اے آدم آپ ہمارے جدّ امجد ہیں' آپ کو اللہ پاک نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ جنت کی تمام نعمتیں آپ کے لیے مہیّا کیں تو پھر آپ نے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی لغزش کیوں کی؟ آپ نے ہمیں نقصان میں ڈال دیا اور آپ نے ہمیں جنت سے نکلوا دیا تو حضرت آدم نے جواب مرحمت فرمایا: اے موسیٰ تم وہ ہو جس کو اللہ نے اپنی ہمکلامی کے لئے چنا اور اپنی رسالت کے لئے چنا اور تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کتاب تورات لکھی تو تم اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہو جو اللہ نے میرے لئے میری پیدائش سے بھی چالیس سال پہلے لکھ ڈالی تھی؟ تو حضورؐ نے فرمایا: حضرت آدمؑ حضرت موسیٰؑ پر غالب آ گئے۔ (قصص الانبیاء)

ٹیک نے آ لیا اور وہ اپنے تخت پر ہی مر گیا اس قصے کے ختم ہوتے ہی ہر طرف سے آپ کو قہقہے سنائی دیں گے اور ساتھ ہی ایک آواز گونجے گی اوہ بھائی صاحب اپنی اپنی گاڑیاں آگے کر لیں گیپ بہت ہو گیا ہے پھر آپ اپنی گاڑی کو اسٹارٹ کریں گے اور چند قدم کی دوری طے کریں گے۔

یہ ایک مختصر سی منظر کشی ہے اس ذاتی تجربے کی جب آپ اس سی این جی لائن یا پاکستانی دیوارِ چین کا حصہ بنتے ہیں۔ گویا یہ ایک بیٹھک ہے جہاں آپ مختلف کلچر کی باتوں اور قصوں کہانیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور حکومت کو بھی آپ کے ان بڑھتے ہوئے مراسم سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ صرف اپنے اقتدار کو بچانے اور پختہ کرنے میں مصروف ہے۔ بہر حال اس بیٹھک کا اختتام ایک دوسرے کے ساتھ اپنے اپنے موبائل نمبرز کے تبادلے کے ساتھ ہوتا ہے تا کہ اگلے دنوں میں جب گیس کھلے تو پتہ چل سکے کہ کون سے پمپ پر سی این جی کی لائن مختصر ہے۔

نمرہ شکیل' کالج آف الیکٹریکل اینڈ مکینیکل انجینئرنگ

مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

سخن فہمی اور مزاج میں ہمیں دعویٰ ضرور ہے لیکن صرف اس حد تک کہ ان کارہائے پیچیدہ میں ہمیں دور دور تک کوئی دعویٰ نہیں۔

دراصل ایک برے بلکہ نہایت برے سامع ہونے کے باعث ہم سننے کی بجائے سنانے پر یقین رکھتے ہیں اور اس قدر کہ بیچارے' قسمت کے مارے سامعین کو ہاتھ جوڑ کر ہم سے قصہ مختصر کرنے کی درخواست کرنا پڑتی ہے۔امتحانات بھی ہم نے ہمیشہ اسی طرح دیئے ہیں کہ سوالیہ پرچے میں چیدہ چیدہ الفاظ نشان زد کر لیے اور ان سے متعلقہ (اور غیر متعلقہ) جس قدر مواد ہمارے ذہن میں ہوا' اسے اپنے پیچیدہ خط میں جوابی کاپی پر منتقل کر دیا۔خیر امتحانات میں تو ہم سے کسی شعر کے معنی دریافت کر بیٹھے تو ذرا مسئلہ ہو جاتا ہے۔اب ایسا نہیں کہ ہم معنی نہیں بتا سکتے' کیونکہ ہم دریافت سے زیادہ ایجاد پر یقین رکھتے ہیں۔پریشانی صرف اس قدر ہے کہ جو مفہوم ہم کسی شعر سے برآمد کرتے ہیں وہ شاعر تو کیا' اس کے ہمسایوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔تو ایسی صورتحال میں ہم فی البدیہہ بھاری بھرکم لکچر جھاڑتے ہیں جو سراسر غیر متعلقہ دلائل پر مبنی ہوتے ہیں۔مگر جب معاملہ مضمون نویسی سے ٹیڑھے اور خشک کام تک آ پہنچے تو ہمیں چاروناچار تخمین وظن کے گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔لہٰذا موضوع کے طور پر دیئے گئے مصرعے سے ہم نے جو جو مطالب اخذ کیے' اخذ کرنا چاہے یا اخذ کرنے کی سعی کی' ان کی روداد ہم بیان کرتے ہیں' یگانہ کی روح سے معذرت کے ساتھ کہ ان کے اچھے بھلے مصرعے کو تختۂ مشق بنانے کے لیے منتخب کرنے میں ہمارا ہاتھ قطعاً نہیں۔

پہلی بات جو ہماری سمجھ میں آئی' وہ یہ ہے کہ شاعر ایک رقیق القلب' امن پسند اور صلح جو انسان ہے جس نے آج تک شاید بقرعید پر بکرے تک ذبح ہوتے نہیں دیکھے۔اسے ڈر ہے کہ اگر وہ تیشہ اپنے سر پر مار لے تو اس کا ہاتھ ٹھیک نہ بیٹھ سکے گا اور ضرب سیدھی نہ پڑ سکے گی۔قوی اندیشہ ہے اس امر کا کہ اسے پھٹے سر کے ساتھ ادھ کھدے پہاڑ سے نیچے اترنا پڑے اور مرہم پٹی کے لیے ہسپتال جانا پڑے۔پس واضح ہوتا ہے کہ اپنی صلح جوئیانہ طبیعت کے باوجود شاعر ایک معاملہ فہم اور سمجھدار شخص ہے اور ہمارے ہاں کے ہسپتالوں کا واقفِ حال بھی۔لہٰذا ایسی موت کو جس کے ساتھ ساتھ مضروب ہو کر شفا خانے کا چکر لگانے کا امکان بھی موجود ہو' دور سے ہی سلام کرتا ہے۔

اگر ہماری رائے مانگی جائے تو ہم کہیں گے کہ سر پر تیشے سے تیز دھار چیز مارنا نہایت خطرناک حرکت ہے۔مرنے کی تو خیر ہے لیکن اگر خدانخواستہ آنکھ پھوٹ گئی یا ناک کٹ گئی تو عمر بھر کی مصیبت ہو جائے گی۔زندگی تو آنی جانی چیز ہے مگر ناک سلامت رہنی چاہیے۔بہتر ہوگا کہ مارنے کے اس فعل کے لیے گردن کو مفعول ٹھہرایا جائے تاکہ ایک ہی وار میں شہ رگ کٹ جائے۔برسبیلِ تذکرہ' اگر زندگی کا خاتمہ ہی مقصود ہے تو اس کے لیے سڑکوں پر پیدل بھی پھرا جا سکتا ہے۔

لیکن ان صاحب کی حالت کے تئیں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے اپنے ملک میں ٹھہرنے کا مشورہ دیں تاکہ روز روز خون بہتا دیکھ کر دل ذرا مضبوط ہو جائے۔ خوفِ فسادِ خلق سے ہم تفصیلات دینے سے پرہیز کرتے ہیں' مگر ہمارے بہت سے شہر اس کام کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ قصابوں کے جیومیٹرک سیکوئنس میں بڑھتے ہوئے نرخوں سے گھبرا کر ایک نہ ایک دن جنابِ شاعر کو اپنا بکرا خود ذبح کرنا پڑے گا۔ میانِ کو ہساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک' سو بہتر ہوگا کہ اٹھیں اور کوئی کام کا کام کریں۔

ایک اور معنی جو ذرا دیر میں نکلے ہیں' وہ یہ ہیں کہ شاعر روز افزوں ترقی پذیر ماحولیاتی آلودگی سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کچے مکان تو نظیر آبادی کے دور میں بھی گرا کرتے تھے مگر آنے والے عہد کی تیزابی بارشوں کے سامنے ایک بلند و بالا پہاڑ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا' لہٰذا وہ کام سے پیوستہ رہ کر امیدِ بہار رکھے ہوئے ہے کہ یہ بارشیں اس کے حصے کا باقی کام کر دیں گی اور وہ آرام سے ہاتھ جھاڑ کر لوگوں کو کہہ سکے گا' نہ جنوں رہا' نہ پری رہی۔''

یہ بھی ممکن ہے کہ پہاڑ اور اس کے اردگرد کا علاقہ کسی صاحب اختیار نے کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کے لیے منتخب کر لیا ہو اور شاعر اب اپنے کام (اور پہاڑ) کا معاوضہ پانے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ بیچارہ! ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے اس بظاہر لامتناہی ڈرامے میں از خود پردہ کھینچ دینے کے لیے جس ذہنی جرات اور قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ امتدادِ زمانہ نے شاعر سے چھین لی ہے۔ اب وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اسے دنیا کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے یا نہیں۔ ہم کسی اور کی قوتِ ارادی پر تبصرہ محفوظ رکھتے ہیں کہ ہمارا اپنا رویہ یہی ہے کہ ہر کام اور ہر مضمون کو' چاہے وہ کتنا ہی بیکار اور مہمل نہ ہو' کھینچتے رہتے ہیں۔ یہاں ہم یہ سوچ کر اپنے آپ کو بہلا لیتے ہیں' ختم شد' سے ڈرنے میں ہم اکیلے نہیں بلکہ تقریباً پوری دنیا ہمارے ساتھ ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر کا تعلق عوام الناس کے اس بڑے حصے سے ہو جو امید کی افیون پر زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ ایسی صورت میں شاعر یہ کہہ رہا ہو گا کہ آخر کار ہر پہاڑ کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے۔ آج نہ سہی کل سہی۔ میں لاکھ مردم گزیدہ سہی مگر سگ گزیدہ ہرگز نہیں کہ اپنی زندگی بدستِ خود ختم کر ڈالوں۔ ہوا بھی خوشگوار ہے' گلوں پہ بھی نکھار ہے وغیرہ وغیرہ۔ خیر ہم شاعر کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہے کہ زندگی دراصل چلتے رہنے سے ہی عبارت ہے۔ امید ایک دھوکا سہی مگر اسی گمانِ دلفریب کے سبب زندگی کا کارخانہ حرکت میں ہے۔ اگر نوحِ انسانی کو رات کے اندھیرے کے بعد آفتاب کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو تو ظلمتِ شب بہت سوں کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔ اوروں کا کیا مذکور' ہم خود اسی امید پر قلم گھسیٹتے اور اچھے بھلے کاغذ کا ستیاناس کرتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن لکھنا سیکھ ہی لیں گے۔

چور کا ہاتھ اور وزیر کی زبان دونوں کاٹ دو

بادشاہ نے گدھوں کو قطار میں چلتا دیکھا تو کمہار سے پوچھا یہ کیسے سیدھے چلتے ہیں' کمہار نے جواب دیا۔ جو لائن توڑتا ہے اسے سزا دیتا ہوں بس اسی لیے یہ سیدھے چلتے ہیں۔ بادشاہ بولا میرے ملک میں امن قائم کر سکتے ہو۔ کمہار نے حامی بھر لی' شہر آئے تو بادشاہ نے اسے منصف بنا دیا اور ایک چور کا مقدمہ آ گیا۔ کمہار نے کہا اس کا ہاتھ کاٹ دو' جلاد نے وزیر کی طرف دیکھا اور کمہار کے کان میں بولا یہ وزیر صاحب کا خاص آدمی ہے۔ کمہار نے دوبارہ کہا اس کا ہاتھ کاٹ دو تو وزیر نے سرگوشی کی کہ یہ اپنا آدمی ہے۔ خیال کرو' کمہار نے کہا چور کا ہاتھ اور وزیر کی زبان دونوں کاٹ دو اور اس ایک فیصلے سے ہی ملک میں امن ہو گیا۔

مسکرایئے

ایک شوہر (اپنی بیوی سے): ''تمہارے دل میں میرے لیے کتنی عزت ہے؟''

بیوی: ''اگر آپ چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہوں تو میں نیچے بیٹھ جاؤں گی۔''

شوہر: ''اور اگر میں نیچے بیٹھ جاؤں تو...''

بیوی: ''تو میں ایک گڑھے میں بیٹھ جاؤں گی۔''

شوہر: ''اور اگر میں گڑھے میں بیٹھ جاؤں تو...''

بیوی (غصے سے): ''تو میں اوپر سے مٹی ڈال دوں گی۔''

☆☆☆☆☆

میاں بیوی ڈاکٹر کے پاس گئے

کلینک سے نکل کر بیوی بولی:

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مختلف ملکوں کی سیر کرو تا کہ طبیعت پر اچھا اثر پڑے''

شوہر سر کھجاتے ہوئے ''اچھا...''

بیوی: ''تو اب آپ فیصلہ کر لیں کہاں کہاں جانا ہے؟''

شوہر: ''چلو دوسرے ڈاکٹر کے پاس...''

☆☆☆☆☆

تین سردار موٹر سائیکل پر جا رہے تھے

ٹریفک پولیس والے نے ہاتھ کا اشارہ دے کر روکا

اِدھر سے سردار نے بھی ہاتھ دیا

''نہ باؤ جی اسی پہلے ہی تین آں''

☆☆☆☆☆

''بیٹے ایک اور آئس کریم کھاؤ گے۔'' کنجوس باپ نے پوچھا۔

''لیکن ابو میں نے تو ایک آئس کریم بھی نہیں کھائی۔'' بیٹا حیرانی سے بولا۔

''تم بھول رہے ہو بیٹا پچھلے سال جب ہم یہاں آئے تھے تو ایک آئس کریم نہیں کھائی تھی؟''

ایک نیا ڈاکٹر پاگل خانے کا دورہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا جو خاموشی سے بیٹھا تھا جبکہ باقی پاگل اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ''تم مجھے پاگل تو نہیں لگتے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انہوں نے مجھے زبردستی قید کر رکھا ہے بھلا بتائیں کہ ایک آدمی جو دو سو صفحات پر مشتمل کتاب لکھ لے وہ پاگل کیسے ہو سکتا ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تو آپ مصنف ہیں، ذرا مجھے اپنی کتاب تو دکھایئے۔'' اس شخص نے فوراً ایک کتاب ڈاکٹر کو دی جس کے پہلے صفحے پر سوال لکھا تھا۔ ''جب گھوڑا دوڑتا ہے تو آواز کیسی پیدا ہوتی ہے؟ اس لائن کے نیچے سے لے کر آخری صفحہ نمبر دو سو تک یہ لکھا تھا۔

''ٹھکا ٹھک، ٹھکا ٹھک...''

☆☆☆☆☆

استاد: بھینس کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟

شاگرد: سر! یہ تو کوئی بیوقوف بھی بتا دے گا۔

استاد: اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

امی: ''منے! یہ دروازے پر گندے ہاتھوں کے نشانات تمہارے ہیں''؟

منّا: ''جی نہیں امی جان! میں تو ہمیشہ لات مار کر دروازہ کھولتا ہوں۔''

☆☆☆☆☆

بیوی: ''تم سوتے ہوئے مجھے گالیاں دے رہے تھے؟''

شوہر: ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

بیوی: ''کیا غلط فہمی ہوئی ہے؟''

شوہر: ''یہی کہ میں سو رہا تھا۔''

غزل

پروفیسر اصغر قادر

سنتے تھے ہم کہ دن بُرے آئے ہیں حال میں
ہیں تو وہی خطائیں، ندامت نہیں رہی

وہ دِن بھی تھے کہ کام میں لگتا تھا جی مرا
وہ دِن ہیں اب کہ کام میں لذّت نہیں رہی

ہم بھی کبھی جوان تھے، تھا عشق بھی جواں
نہ اب وہ شوخیاں، وہ شرارت نہیں رہی

سر گشتگی جو تھی تو جوانی کے جوش سے
مجنوں تو اَب بھی ہیں پر وہ شہرت نہیں رہی

کیا آنکھ دیکھتی تھی کہ ہر سُو تھا ولولہ
کیا آنکھ بجھ گئی ہے یا حرکت نہیں رہی؟

وہ دِن بھی تھے کہ کھیل سے فرصت نہ تھی ہمیں
یہ دِن بھی ہیں کہ کام سے فرصت نہیں رہی

رُک رُک کے تم نے مُجھ کو بُلایا تو کیا مزا
رسم و رسوم ہی رہا دعوت نہیں رہی

ظالم نے مسخرے کا سا پہنا ہوا تھا روپ
اُترا ! خطا وہیں تھی حماقت نہیں رہی

مشفق ہیں اِس جہان میں یوں تو بہت سے لوگ
جو وہ گئے، جہاں میں اب شفقت نہیں رہی

ہیں تو سخی جہان میں یوں ہزارہا
ہوتے رہیں کہ اب تو سخاوت نہیں رہی

سچا تھا ایک شخص جو دُنیا سے جا چُکا
اہلِ جہاں کو حق کی بھی عادت نہیں رہی

قادر کو جو منظور تھا دُنیا سے چل بسا
اب تو کسی بھی کام میں برکت نہیں رہی

اصغر سے پوچھیئے کہ یہ کیا حال کر لیا
اپنوں سے کیا کہ اپنے سے فرصت نہیں رہی

غزل

محمد عثمان اختر، این آئی سی ای

جو آپ آئے تو یاد آیا ہے گل کو گل سے بہار ہونا
شرر کو شعلہء شمس ہونا، ندی کو اک آبشار ہونا

پری رُخوں نے یہ صاف لہجے میں عاشقوں کو بتا دیا ہے
''ہمارا پیشہ یہی ہے لوگوں کا دل چُرا کر فرار ہونا''

اُدھر وہ آتے ہیں مسکراہٹ دبی دبی سے لبوں پہ رکھ کر
اِدھر میں گم ہُوں، سکھا دیا کس نے اس کو فتنہ نگار ہونا

یہ بات ان سے کہے بِنا نہ بگڑ سکے گی نہ بن سکے گی
ہو چاہے تقدیر میں مِری اب ذلیل ہونا، خوار ہونا

سما سے تارے بھی توڑ لاؤں یا کھودوں نہریں پہاڑیوں سے
جہاں میں سب سے ہے کارِ مشکل تجھے مرا اعتبار ہونا

چلو اب اختر نئے جہاں کی تلاش میں زندگی بِتائیں
عبث تھا دنیائے عاشقی میں ہر اک گھڑی بے قرار ہونا

غزل

اسامہ وقار بھٹی، SEECS

نہ ہو پریشاں کہ منزل ابھی ملی کہ نہیں
یہ فکر کر کہ تجھے زندگی ملی کہ نہیں

اس احتمال کو چھوڑ ، کون کتنا آگے ہے
تجھے کہیں وہ فغانِ نیم شبی ملی کہ نہیں؟

کمالِ منزلِ ہستی ہے کاروانِ طَلَب
محبّتوں کی جو دنیا کھوئی، ملی کہ نہیں؟

ترے عُروجِ شجاعت کو بھی دیکھا میں نے
تری طَلَب کو ابھی تشنگی ملی کہ نہیں؟

یہ سازِ دِل ہے کہ بانگِ درا ہے اے رہبر!
تجھے تو راہِ مراحل کبھی ملی کہ نہیں

سجودِ پاک کے گر ساتھ جُہد پیہم ہو
یہ بھول جاؤ کہ منزل کبھی ملی کہ نہیں

مری صدا تو اسامہ دلوں کی ہے فریاد
ابھی تو مجھ کو مری شاعری ملی کہ نہیں

غزل

کرنل محمد آصف اقبال، ای ایم ای کالج

آؤ پھر ایک روایت کا تصّور کر لیں
جو تخیّل میں رہیں اُن کو مصّور کر لیں

اُن کا اندازِ سُخن، اُن کا طریقہء وفا
ان کی یادوں سے دل اِک بار منوّر کر لیں

ہم تو مجبور ہیں، محبوس ہیں دل کے ہاتھوں
اُن کو مقصود کریں، خود کو مسخر کر لیں

ہاں اُن کو مگر جانا ہے فرض اپنا نبھانا ہے
فرض ان کا بنے قرض، مرض اپنا مقدر کر لیں

رُخصت کے وقت دیکھو آنسو نہ نکل آئیں
دل قابو میں رہے اپنا، خود پر ہی جبر کر لیں

آؤ پھر ایک روایت کا تصّور کر لیں
جو تخیل میں رہیں، اُن کو مصّور کر لیں

غزل

صاحبزادہ عزیراللہ، این آئی سی ای

اس شہرِ خموشاں کے دریچے اداس ہیں
باغیچے بھی سنسان ہیں، غنچے اداس ہیں

آئی ہے میرے شہر پہ ایسی خزاں کہ اب
شبنم ، بہار ، تتلی ، پرندے — اداس ہیں

مالی چمن کا راہیء راہِ عدم ہوا
اب کے برس گلاب کیا ، لالے اداس ہیں

تم کیا گئے کہ شہر کی رونق بھی گل ہوئی
لیل و نہار ، بارشیں ، کوچے — اداس ہیں

یوں جانبِ میخانہ سے گونجی ہے اک صدا
شمع ، خمار ، ساقی و پیالے اداس ہیں

آئی شبِ وصال بھی فرقت لئے عزیر
ان کی ادائیں ، شوخیاں ، دیدے اداس ہیں

غزل

ادیبہ رحمٰن، S^{3}H

سارے بندھن میں توڑ آیا ہوں
مَا سِوا اپنے میں سب کو چھوڑ آیا ہوں

اثاثے انسانیت کی شناخت کے سارے
کئی بار کے حیلوں سے موڑ آیا ہوں

وہ جو راحتیں تھیں کِسی بہار کی
مٹی کے وہ گروندے توڑ آیا ہوں

پہلے مظلوم تھا یہ آج کا قاتل
رشتہ اب ظلم سے جوڑ آیا ہوں

زخم دِکھتے بھی تم کو کیسے
کفن کی چادر جو اوڑھ آیا ہوں

محفل میں کوئی بھی مخلص نہ ملا
یہ بیاں دے کر میں دوڑ آیا ہوں

اَنا نے جب سے ہے ہاتھ پکڑا عدی
راستوں میں اُسے تنہا چھوڑ آیا ہوں

غزل

سیّد شوزیب عباس، SEECS

اے ارض و سماء سُن لو حقیقت کا فسانہ
کڑوہ ہے مگر سچ یہ حقیقت کا فسانہ

آ جاؤ میرے دِل کے سمندر میں دیکھ لو
گر دِل ہو کسی اور بشر کا ہی ٹھکانہ

پھر چھوڑ جانا تُم مجھے طوفان کی مانند
بن جائے سمندر میرا اُس غم کا ٹھکانہ

جس غم میں مبتلا تھا یہ اُس شام سے پہلے
جس شام سے قبل یہ زندگی تھی ویرانہ

ممکن نہیں خیال کسی اور کے ہیں ہم
گر ہو جائے خطا تو سزا مجھ کو دلانا

کر لو میرا یقین کہ ایسا نہیں ممکن
نہ بشر کی ہے پہنچ مجھے تُم سے ہٹانا

مجھ کو فقط یقین ہے اُس پاک ذات پر
جس نے کیا یہ کام دو دلوں کو ملانا

احسان بہادر پہ ہے اُس پاک ذات کا
جس نے مجھے نصیب کیا اُس کا ٹھکانہ

اویس عزیز' ایس ایم ایم ای

دوست

لوگوں کے ہجوم میں ہمیں ایک دوست کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ کچھ سوال بڑے خوددار ہوتے ہیں یہ سوال زبان سے ادا نہیں کیے جاتے یہ صرف آنکھوں میں لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان سوالوں کو پڑھنے کے لئے محبت کے ساتھ آنکھوں میں جھانکنا پڑتا ہے اور جو ان سوالوں کو محبت اور شفقت سے پڑھ لے وہ دوست کہلاتا ہے۔

میری خوبصورت' گوری چٹی' دراز قد' تیز نقوش اور بڑی آنکھوں والی نانی اماں' جن کو ہمیشہ میں نے اپنا سب سے قریبی سمجھا۔ ان کے بڑھاپے میں اتنا حسن' تقدس' وقار اور کشش تھی کہ بیسیوں جوانیاں قربان کی جاسکتی تھیں اور جن کی مسکراہٹ میں ہمیشہ ایک مخلص دوست کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ میرے نانا کو زندگی میں صرف دو کام آتے تھے۔ ایک دوکانداری اور دوسرا حکم چلانا۔ انہوں نے ساری عمر نانی اماں سے سیدھے منہ بات نہ کی حالانکہ ان کی شادی کی بنیاد محبت تھی' شاید میرے نانا اپنی انا کے ہاتھوں مجبور تھے جو کئی بار ریزہ ریزہ ہوئی مگر کبھی نہ بکھری۔ نانی اماں آدھی آدھی رات چولہے کے پاس بیٹھ کر نانا ابو کا انتظار کرتیں اور جب نانا ابو آتے تو نانی اماں کی آنکھوں کے جگنو خوشی سے ٹمٹمانے لگتے۔ وہ خوشی خوشی ان کو گرم گرم روٹی بنا کر دیتی نہ کبھی نانی اماں نے ان سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی نہ کبھی نانا نے بتانے کی زحمت کی۔ میری نانی اماں سے دوستی عشق کی حد تک رہی۔ میں نے عمر بھر نانی اماں کی زبان سے کبھی شکوہ نہیں سنا۔ ان کی محبت اور احترام کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نانا ابو کی شکایت بھی اپنے آپ سے کی۔ مجھے نانا ابو کا نانی امی سے رویہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے آج تک نانا ابو سے نفرت نہیں ہوئی۔ کیسا عجیب دور تھا کہ لوگ اس طرح نفرت کے لفظ سے نا آشنا تھے جیسے اس دور کے لوگ محبت سے ہیں۔ شاید وہ دور بچپن کا تھا اور بچپن تو بغیر کھلونوں کے بھی جوانی سے اچھا ہوتا ہے۔

گھر کے آنگن میں لگے پیپل کے درخت' جس پر پرندوں کے بے شمار گھونسلے آباد تھے کہ نیچے بیٹھے میں نے نانی امی سے پوچھا آپ جنت میں کیوں جانا چاہتی ہیں۔ نانی مسکرائی اور بولی پتر' جنت میں جنتیوں کو سوہنے رب کا دیدار کرایا جائے گا' میں نے کہا نانی امی یہ جنت کیسے ملتی ہے؟

نانی اماں بولیں بیٹا یہ جنت صرف اسی کو ملے گی جو اس دنیا کو جنت بنائے گا۔ وہ سچ ہی تو کہتی تھیں انہوں نے گھر کو نانا ابو کے لئے جنت ہی تو بنایا ہوا تھا۔

جس دن نانی اماں اَن دیکھے جہان کے سفر کے لئے روانہ ہوئیں انہوں نے بھی جاتے جاتے میرے نانا سے ایک خوددار سوال کیا ''ہم زندگی میں کبھی دوست کیوں نہ بن سکے؟'' نانا نے اپنی شریکِ حیات کی آنکھوں میں محبت سے جھانکا اور اس خوددار سوال کا جواب آنسوؤں کی صورت میں دیا۔ میری نانی اماں اس انا کے بت کو ٹوٹتا دیکھ کر رو پڑیں اور نانا ابو کو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاف کر کے اگلے سفر پر روانہ ہوگئیں۔ نانا نے مجھے گود میں اٹھا کر خوب چوما اور خوب پیار کیا۔ ان کے آنسوؤں سے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے۔ اُن کی سیاہ آنکھوں میں غروب ہوئے سورج کی سرخی جھلکنے لگی اور پھر وہ اپنی ٹوٹتی

اور ڈوبتی ہوئی آواز میں بولے۔

''وقار پُتر آج میں یتیم ہوگیا''

نانی اماں کی آٹھویں برسی تھی جب میں اور نانا ابو ان کی قبر پر پھول ڈال رہے تھے تو نانا کی آنکھیں موسلا دھار بارش کی طرح تھیں جو مسلسل برس رہی تھیں۔ دعا مانگنے کے بعد نانا نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور بولے'' وقار بیٹا میں بے پناہ محبت کے باوجود تیری نانی کا دوست نہ بن سکا اور میری آنکھوں میں دیکھا اور بولے میں کیسا آدمی ہوں؟''

میں نے کہا مجھ سے آپ کیا پوچھتے ہیں میں تو ابھی تک خود کو نہیں جان سکا اور میں تو آج تک یہ بھی نہیں معلوم کر سکا کہ مجھے میرے آنسو دینے والے یا میرے آنسو پونچھنے والے زیادہ پیارے ہیں۔

نانا کا کمزور' پتلا' دُبلا جسم ہوا میں لڑکھڑانے لگا جیسے خشک خزاں میں زرد پتے۔ انہوں نے درخت کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں' میں نے رومال سے نانا کی آنکھیں صاف کیں۔ اور پیار سے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا' نانا ابو آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک نمی سی رہتی ہے اور نم آنکھوں والے لوگ تو بہت اچھے ہوا کرتے ہیں۔ نانا ابو میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پچھلے آٹھ سالوں میں ان کی پہلی مسکراہٹ تھی اور میری ان سے ایک دوستی سی پیدا ہوگئی جو کہ وقت کے ساتھ ایک مضبوط اور خالص رشتے میں بدل گئی۔

میں اپنی فلائٹ سے کراچی کی طرف جا رہا تھا اور اس دن صبح سے میرے ذہن میں عجیب سی خلش تھی اور بار بار مجھے نانا ابو کی یاد آ رہی تھی اور ان سے ملنے کا دل چاہ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جب فون اٹھایا تو دوسری طرف میری امی تھیں اور وہ رو رہی تھیں اور میرا دل ڈوب رہا تھا کہ اچانک میں سکتے میں چلا گیا۔ جب امی کے الفاظ سنے'' بیٹا تمہارے نانا اس دنیا سے پردہ کر چکے ہیں وہ تمہیں بہت یاد کر رہے تھے''

میں اسی وقت لاہور کی طرف روانہ ہوگیا جب میں نے گھر کے اندر قدم رکھا تو سارا گھر اجڑا سا تھا جیسے ایک طوفان سے ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو۔ میں سیدھا کمرے میں داخل ہوا تو نانا ابو کو دیکھ کر مجھے ان کی بات یاد آ گئی کہ ''میں تمہیں کیسا لگتا ہوں''۔

آج وہ دن تھا کہ مجھ سے میرا ایک اور دوست بہت دور جا چکا تھا اور میں نے اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کیا۔ نانی اماں اور نانا ابو جیسے دوستوں کے جدا ہونے کے بعد میری زندگی اس گیس کی مانند تھی جس کا نہ کوئی رنگ اور نہ ہی کوئی ذائقہ۔ دیوانگی اور بے چینی کی اس حالت میں کئی برس بیت گئے۔ وقت کا مرہم بھی بے اثر نظر آ رہا تھا۔ پہلے نانی اماں اور نانا ابو کی جدائی کے کانٹوں نے میری روح کے لباس کو جگہ جگہ سے چھلنی کر رکھا تھا۔

اگر میں یادوں کا پیوند نہ لگاتا تو کب کا بے لباس ہو جاتا۔

ایک دن اچانک بیٹھے ہوئے مجھے نانی اماں کی ایک بات یاد آ گئی اور اس بات نے مجھے اتنا سکون دیا کہ میں نے ایک ایسے دوست سے دوستی کی جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا اور کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

''نانی اماں رب کیسے ملتا ہے؟''

''اطاعت اور عبادت سے بیٹا''

''نانی اماں یہ اطاعت کیا ہوتی ہے؟''

''بیٹا اطاعت اس کو کہتے ہیں جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو' اس کو مانا جائے۔''

''بیٹا اللہ رسول کی زندگی کو اپنانا اور ان جیسا طرزِ عمل کرنا۔''

''نانی اماں سب سے بہتر دوست کون ہے؟''

''بیٹا رب سب سے اچھا دوست ہے۔''

''نانی اماں رب کیسے ملے گا؟''

''بیٹا اس کے لیے پہلے خود رب کا دوست بننا ہوگا۔۔۔''

بزمِ ادب' ای ایم ای

ادھوری خواہش

''نہیں! اب تعلیم میرے کسی کام کی نہیں۔ اب میں مزید نہیں پڑھ سکتا۔''
اجمل ہاتھ میں سیاہ رنگ کا مشروب لیے سکول سے نکل رہا تھا کہ یہ الفاظ سن کر ٹھٹھکا۔ یہ آواز کسی اور کی نہیں' اس کے دوست اصغر کی تھی جسے سب بلاّ کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ علی کے ساتھ سکول کے دروازے کی داہنی جانب کھڑا تھا۔ اجمل نے بھی وہیں کا رخ کیا۔ اجمل اور علی دونوں ہی حیرت کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ وجہ دریافت کرنے پر 'بگے' نے دردبھری آواز میں کہا۔

''یار! یہ تعلیم میرے کس کام کی ہے؟ میرا ابا پوٹی بی کا مریض ہے' کام پہ جا نہیں سکتا۔ آج بھی جب اسے ٹی بی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ اتنا کھانستا ہے کہ کھانس کے ہانپنے لگتا ہے اور ہمارے گھر کا چولہا آج بھی ٹھنڈا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد بڑی بہن سلمٰی نے گھر سنبھالا۔ اب وہ فاقوں سے ڈھانچا بنی جا رہی ہے۔ آج نواں دن ہے کہ باپو کام پر نہیں گیا اور ہمارے گھر میں فاقوں کا راج ہے۔''

''مگر تم کر بھی کیا سکتے ہو۔'' اجمل نے حیرت بھری نظر سے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں محلے میں سائیکلوں کی دکان پر گیا تھا۔ وہاں کام کر کے کچھ نہ کچھ گھر چلا ہی لوں گا۔'' اصغر کی آواز میں موجود درد بڑھتا جا رہا تھا۔

''تم نے چوہدری صاحب سے بات کی'' علی نے لقمہ دیا۔

''ہاں گیا تھا وہاں مگر انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔'' تینوں سامنے موجود باغیچے کی طرف بڑھ رہے تھے تو اصغر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نہیں مانتا کہ انہوں نے انکار کیا ہوگا۔'' اجمل نے جواباً کہا۔ انہوں نے پچھلے دنوں محلے کی عورتوں میں مفت سلائی مشینیں تقسیم کی ہیں۔''

''تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ان کے ساتھ میڈیا تھا' فوٹو گرافر تھے' پریس تھا۔ میرے ساتھ کیا تھا؟ پھٹا ہوا پاجامہ یا بوسیدہ قمیض'' اصغر اتنی بات کرتے ہوئے چل دیا۔

''یار! ہر سال حج پر جانے سے پہلے تو وہ ایک عظیم الشان دعوت کرتے ہیں۔ اگر ایک دعوت کا پیسہ کسی غریب کو مل جائے تو کتنا اچھا ہوتا۔ بھئی کنویں سے دو لوٹے پانی کے دے کر اگر ایک غریب کی کھیتی ہری ہو جائے تو کنویں کو کیا فرق پڑتا ہے'' علی نے اصغر کے جاتے ہی کہا۔

اجمل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''بالکل! اگر مدینہ شریف میں سنہری جالیوں والی سچی سرکار نے پوچھ لیا کہ تم سے ایک غریب کی کفالت نہیں ہوئی تو کیا جواب دیں گے چوہدری صاحب! کیا جواب دیں گے؟'' دونوں کے چہروں پر غم کے آثار واضح تھے۔ وہ اپنے دوست کی پریشانی میں دیر تک بیٹھے بحث کرتے رہے۔

اصغر بازار میں داخل ہوا تو حمید دکاندار نے آواز لگائی۔'' اوئے بلے! بات سُن۔''

اصغر پاس گیا اور بولا ''جی بھائی جی! کہیے کیسی طبیعت ہے آپ کی'' حمید نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔'' تیرا باپ کیسا ہے؟'' اصغر نے منہ جھکاتے ہوئے کہا'' جی کیا بتاؤں؟ بہت بہتر ہیں مگر مکمل صحت یاب نہیں ہوئے۔''

اتنے میں ایک گاڑی پاس سے گزری جسے دیکھ کر حمید بولا'' سلام صاحب جی! کیسے مزاج ہیں؟ بڑے صاحب جی کی سنائیں۔'' مگر جواب ندارد رہا اور حمید دوبارہ اصغر کی طرف متوجہ ہو کر بولا'' ہاں تو وہ پچھلے مہینے ڈیڑھ سو روپے کا سودا گیا تھا گھر۔''

''جی بالکل گیا تھا۔'' اصغر نے جواب دیا۔

''ابھی تک پیسے نہیں آئے۔'' حمید کی آواز میں غصہ تھا۔

''جی آج کل کام مندا ہے جیسے ہی پیسے آئے دے جاؤں گا۔''

''تم لوگوں کو ادھار دینا ہی نہیں چاہیے۔ پہلے تم لوگوں کی منتیں ختم نہیں ہوتیں اور بعد میں ہمیں رقم واپس لینے کے لیے منتیں کرنی پڑتی ہیں۔'' حمید کی آواز میں غضب انتہا کو تھا۔

اس کے بعد دکان میں موجود ہر شخص اصغر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ حمید دکاندار کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک مزدور کے گھر کیوں پیدا ہوا' اس کا باپ مزدور کیوں ہے؟ اگر ان کے گھر میں دولت نہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ کیا اس دنیا میں صرف روپے کی عزت ہے؟ تیز ہوا چلنے لگ پڑی تھی۔ وہ فضا کی خنکی اندر تک محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک قطرہ نکلا اور اس کے رخسار کی زینت بن گیا۔

''بھائی کیا بنا؟ کچھ کھانے کو لائے؟'' سلمٰی نے پریشان اصغر کے پاس بیٹھتے ہوئے بات شروع کی۔

''نہیں! نہیں مل سکا کچھ کھانے کو۔ پورا دن سائیکلوں والے کے پاس سر کھپانے کے بعد 30 روپے ملے تھے اور اس میں کیا ملتا ہے'' اصغر نے بہن کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی فکر مت کرو میں رہ لوں گی تم جانتے ہو کہ اب مجھے بھوک سے محبت ہو گئی ہے بھوک اب مجھے کچھ نہیں کہتی۔ مگر اس معصوم کو تو یہ عادت نہ ڈالو۔ ہماری بہن ابھی بہت چھوٹی ہے'' سلمٰی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''اچھا میں کچھ کرتا ہوں۔'' اصغر اٹھ کر چل دیا۔

''آپ چاچا حمید کی دکان سے کیوں نہیں کچھ لے آتے۔'' سلمٰی نے پیچھے سے آواز دی۔ اصغر کے کانوں میں حمید دکاندار کی آواز گونجی کہ ہمیں رقم واپس لینے کے لیے منتیں کرنی پڑتی ہیں۔'' اچھا کچھ کرتا ہوں۔'' اس کی آواز میں موجود درد اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ صرف بہن کو جھوٹی تسلی دے رہا ہے۔ جس دور میں دالوں کے بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہے ہوں تو صرف 30 روپے میں وہ کہاں سے کچھ کھانے کو لاتا؟

''منشی جی! باپو بیمار ہے مجھے کام دے دیجیے میں کیا میری آنے والی سات نسلیں آپ کی غلام رہیں گی۔'' اصغر نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''بھئی دیکھو اس طرح ہے کہ میرے پاس تو مزدور پورے ہیں مگر کوشش کرتا ہوں کہ اگر کہیں جگہ ملی تو تجھے بلا لوں گا۔'' منشی نے سامنے موجود اوراق کھنگالتے ہوئے کہا۔

''منشی جی میں جانتا ہوں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں طاقت اور سفارش کا زور چلتا ہے۔ خدا ہے اور برحق ہے مگر روپیہ ناخدا بن چکا ہے۔ مگر میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں'' اصغر کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے

اس کی آواز میں لرزش تھی' نگاہوں میں التجا تھی اس کے دل میں امید کی تھوڑی سی کرن باقی تھی جو کہ اب منشی جی کے رحم وکرم پر تھی۔

''دیکھو بگے! کل سے چوہدری جی کے ہاں تعمیر شروع ہوگی۔ تو کہے تو میں بات کروں گا مگر روزانہ کے 300 روپے ملیں گے۔ نہ ایک روپیہ کم نہ ایک زیادہ۔''

منشی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ احسان کر رہا ہے جیسے اس سے بڑا احسان کرنے والا کوئی اور نہ ہو۔

''ٹھیک ہے منشی جی! میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔'' اصغر مشکور تھا' تشکر آواز سے واضح تھا اور اُس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اوئے بگے چل یہ پانی کی بالٹی اٹھا اور چل وہاں دیوار کے پاس رکھ۔ یہ وہی منشی تھا جس کے سامنے گڑگڑا کر اصغر کو نوکری ملی تھی۔ مگر آج چوہدری صاحب کے ہاں تعمیر شروع ہوتے ہی اسکے رنگ بدل گئے تھے۔ وہ بات بے بات گالی گلوچ کر رہا تھا اور مزدوروں سے ایسے کام لے رہا تھا جیسے اس کے زرخرید غلام ہوں۔ صبح 8 بجے سے کام میں مصروف بگا جب تھک کر چور ہوگیا تو منشی جی کے پاس آیا اور پیسوں کا مطالبہ کیا۔ منشی نے کہا کہ پیسے؟ کس بات کے؟

اصغر بولا'' مجھے کام کرتے ہوئے 8 گھنٹے ہو گئے ہیں اور میں تھکن سے چور ہوں۔''

منشی نے کہا'' لے ابھی تو آدھا دن باقی ہے۔ جب تک دن مکمل نہیں ہوتا تجھے معاوضہ نہیں ملے گا۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ 300 روپے کمانا اتنا آسان ہے؟'' اسی وقت اصغر کی نظر ایک بہت ہی بوڑھے مزدور پر پڑی جو کہ مسلسل مٹی کے تھیلے بھر بھر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو ان میں چھالے پڑ چکے تھے۔ اسے اس مزدور پر بہت ترس آیا اور دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا۔

جب وہ شام کو حمید دکاندار کے پاس پہنچا اور 150 روپے وہاں رکھے تو حمید نے چھوٹے کو بلا کر کہا کہ ان صاحب کو اچھی طرح پہچان لو آئندہ یہ تجھے تیری ماں کی قسم بھی دیں تب بھی انہیں ادھار مت دینا۔ اصغر نے ان باتوں کو سن تو لیا مگر اس کے دل پر بجلیاں گر رہی تھیں۔ اس کا دل حمید کی باتوں میں پوشیدہ نشتروں کا درد دیر تک محسوس کرتا رہا۔ مگر کچھ دیر کے بعد جب وہ کھانے کا سامان لے کر گھر جا رہا تھا تو اس کے دل میں قدرے سکون تھا۔ سلمٰی نے دروازے کی دستک سنتے ہی بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے اپنے بھائی کے ہاتھ میں سامان دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو سلمٰی نے کہا کہ بھائی میں آج بابو کو سرکاری ہسپتال لے کر گئی تھی اور بڑے ڈاکٹر صاحب نے بولا ہے کہ بابو کا آپریشن ہوگا کم سے کم 50 ہزار روپے خرچہ آئے گا۔ یہ بات اصغر پر آسمانی بجلی کی طرح گری۔ وہ گم سُم سا ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جہاں 300 روپے کے لیے انسان کو خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہو جہاں 300 روپے کے لیے دن بھر گھر سے دور رہنا پڑتا ہو وہاں وہ 50 ہزار روپے کہاں سے لائے؟ جہاں سینوں میں دلوں کی جگہ سنگ مرمر ہو' جہاں محبت ومروت کی جگہ نفرت لوگوں کا شیوہ ہو جہاں ایثار کی جگہ خودغرضی ہو جہاں صرف لوگ اپنے پیٹ کی فکر کریں' جہاں ہر چیز پیسے کی محتاج ہو' جہاں ایک نوالہ روٹی کی خاطر عزت گروی رکھنا پڑے وہاں اس کی مدد کون کرے گا؟ 50 ہزار روپے؟ کہاں سے آئیں گے 50 ہزار روپے۔ وہ ابھی اسی سوچ میں گم تھا کہ گڈی نے آ کر اسے جھنجھوڑا اور کہا'' بھائی! بھائی! پتا ہے اگلے ہفتے

عید ہے۔'' ''جی جانتا ہوں میں''

''بھائی میں نے نئے کپڑے لینے ہیں اور پتہ ہے باجی کے سوٹ میں بھی کئی سوراخ ہیں۔ کچھ تو اس قدر بڑے ہیں کہ انہیں چار چار مرتبہ مرمت کیا جا چکا ہے۔ اصغر کے دل میں ایک اور ٹیس اٹھی۔ اس نے کہا میں کل آتا ہوا نیا جوڑا لیتا آؤں گا۔

اگلے روز وہ کام سے سیدھا بازار گیا۔ وہ کپڑوں کی دکان پر تھا۔ ہر کپڑا جو اس کی نظر کو بھاتا دام میں بہت مہنگا ہوتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد اسے بازار میں سستا ترین جوڑا مل ہی گیا جس کے دام 400 روپے تھے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ بازار سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک کی نکڑ پر درخت کی ٹوہ میں بیٹھ گیا۔ اسکے ذہن میں خیالات کی کشمکش تھی۔ وہ بار بار سوچتا کہ اسے یہ زندگی کیوں ملی ہے؟ اس لیے کہ وہ مزدوری کرے؟ وہ اپنی بہنوں کے خواب بھی پورے نہیں کر سکتا؟ کیا وہ باپو کا علاج بھی نہیں کرا سکتا؟ کیا وہ اب اعتبار کے قابل بھی نہیں رہا؟ اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یارب یہ وہ دنیا ہے جہاں تو نے انسان بھیجے تھے مگر آج سب پتلے بن گئے ہیں۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہیں۔ کوئی کسی کے لیے نہیں سوچتا۔ اگر آج میں بھی چوہدریوں کے ہاں پیدا ہوا ہوتا تو میرے ایک وقت کے کھانے کا خرچہ کسی مزدور کی ایک ماہ کی مزدوری سے زیادہ ہوتا۔ کیا بیماری کو غریبوں کا ہی گھر ملتا ہے؟ کیا فاقے صرف مزدوروں کے بچے کرتے ہیں؟ کیا ہمیں خواب سجانے کا کوئی حق نہیں؟ کیا ہمیں اپنی زندگی جینے کا کوئی حق نہیں؟ کیا ہم انسانوں کے طبقے سے خارج ہیں؟ کیا ہمارے اندر کے انسان کو اپنی خواہشات مکمل کرنے کا کوئی حق نہیں؟ آنسوؤں نے اس کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے سے اسے چہرے پر محسوس ہونے والی ٹھنڈک نے آنسوؤں کا پتا دیا۔ وہ اٹھ کر چلا ہی تھا کہ آسمان سے بارش ہونے لگی۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ اس کی بے بسی پر آسمان بھی شرمندہ ہے جو اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے۔

موت کا وقت

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ایک آدمی لرزاں و ترساں حاضر ہوا۔ مارے ہیبت کے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی یہ کیفیت ملاحظہ فرمائی تو پوچھا اے خدا کے بندے! کیا بات ہے؟ تُو اتنا گھبرایا اور مضطرب کیوں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ: ''یا حضرت مجھے عزرائیل علیہ السلام نظر آیا اس نے مجھ پر ایسی غضب آلود نظر ڈالی کہ میرے ہوش وحواس گُم ہو گئے۔ رواں رواں تھرا گیا۔ اب بار بار عزرائیل علیہ السلام کی وہ صورت آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ اس لیے مجھے کسی گھڑی بھی چین نہیں آ رہا۔''

اس نے التجا کی کہ آپ ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے یہاں سے ہزاروں میل دُور ملکِ ہندوستان میں چھوڑ آئے۔ ممکن ہے اس تدبیر سے میرا خوف کچھ دُور ہو جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُسی وقت ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو فوراً ہندوستان کی سرزمین میں پہنچا دے۔ جونہی اس شخص نے قدم زمین پر رکھا۔ وہاں ''عزرائیل علیہ السلام کو منتظر پایا۔'' آپ نے اللہ کے حکم سے اس کی رُوح قبض کر لی۔

دوسرے دن حضرت سلیمان علیہ السلام نے بوقتِ ملاقات حضرت عزرائیل علیہ السلام سے دریافت کیا آپ نے ایک آدمی کو اس طرح غور سے کیوں دیکھا تھا۔ کیا تمہارا ارادہ اس کی روح کو قبض کرنا تھا یا پھر اس بیچارے کو غریب الوطنی میں لاوارث کرنا تھا۔

عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں نے جب اس شخص کو یہاں دیکھا تو حیران ہوا کیونکہ اس شخص کی روح مجھے ہندوستان میں قبض کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ شخص ہزاروں میل دُور یہاں موجود تھا۔ حکمِ الٰہی سے میں ہندوستان پہنچا تو میں نے اس کو وہاں موجود پایا۔

(حکایاتِ رومی)

محمد عثمان اختر' این آئی سی ای

آفاق

وہ کسی سائے کی مانند چلتے چلتے بہت دور آ گئی تھی' آج دفتر سے نکلی تو ہر طرف سنسانی تھی' وہ کسی ایسے رستے پہ چلنا نہیں چاہتی تھی جہاں زندگی کی امید نہ ہو۔اس کے ذہن میں بے شمار خیالات یوں آرام گزیں تھے جیسے وہ مدعو کیے گئے تھے۔ وہ گردوپیش کے حالات سے کچھ دیر تو بے خبر رہی پھر اس نے جائزہ لینا شروع کیا تو اس کی ساری پریشانی ہوا ہوگئی' اُسے اِسی کی ضرورت تھی۔ چلتے چلتے وہ قریبی بازار تک آ گئی جہاں سے آگے اسے سوا میل ابھی اور چلنا تھا۔

بازار سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو مزید سکیڑ لیا' چادر مضبوطی سے کھینچ لی۔ پھر تیز تیز چلنے لگی' وہ دکانوں کے اندر جھانکتی جاتی اور رنگین کپڑے دیکھ کر سوچتی جاتی آخر یہ کس کا نصیب ہوں گے' یہ عورتیں گھنٹوں کھڑی یہاں بحث تو کرتی ہیں مگر نامعلوم وجوہات پر راہِ فرار اختیار کرتی ہیں' ان کے پرس میری طرح شاید بھرے ہوئے نہیں' انہیں شاید معلوم نہیں کہ بے مقصد مباحثوں سے قیمتیں اس قدر گھٹ نہیں جاتیں کہ ہر کوئی یہ رنگین کپڑے خرید سکے۔ یہ تو خواص کے لیے ہیں جو اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے ہی تھان کے تھان پسند کر لیتے ہیں اور یوں خاک اڑاتے چلے جاتے ہیں کہ کبھی یہاں کا رخ نہ کریں گے۔

یہ مرد' ان کی نگاہیں کبھی عورت یا پیسے کے علاوہ بھی کچھ چاہیں گی؟ مرد شاعر صرف محبت کے بھوکے ہیں' انہیں وصل کی رنگ رلیوں سے مطلب ہے' ہجر میں تو یہ بھی عورت کے مساوی اشک بہاتے ہیں' انہیں عورت کے دل کی قیمت نہیں معلوم جس کی ایک ایک امنگ' ایک نیا جہان ہے۔ یہ مرد اگر مزدور ہے تو اسے صرف آرام چاہیے' پیسہ چاہیے... اگر یہ مرد مزدور ہے تو اسے سرمایہ چاہیے' دولت چاہیے... اگر یہ مرد سیاست دان ہے تو اسے شہرت چاہیے' مال چاہیے اور اگر یہ مرد رنڈوا ہے تو اسے صرف اور صرف بیوی چاہیے خواہ وہ عمر کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو۔

وہ سوچتی جا رہی تھی' اُس نے ایسی سوچوں کے درمیان اپنی چادر کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا۔اب وہ برتنوں کی دکانوں کے پاس سے گزر رہی تھی۔ ایک نیا ہجوم برتنوں کا' کتنے ہی خواب عورتوں کے... عورت چاہتی ہے کہ اس کا مرد' اس کی اولاد' اس کا گھر اِن کانچ کے برتنوں کی طرح صاف رہیں' بے داغ' بے عیب... مگر مضبوطی اُن میں فولاد کی سی ہو۔ وہ چھناکے سے ٹوٹ نہ جائیں۔ اُس کی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے۔ وہ لحظہ بھر رک کر ان برتنوں کو دیکھنا چاہتی تھی جو ملکوں ملکوں سے آ کر یہاں' اس دکان کی زینت بن گئے تھے جس کا دکاندار اتنا نحیف و نزار لگ رہا تھا کہ خود ہی چھناکے سے ٹوٹ جائے۔ وہ بوڑھا تھا' اس کی جیبوں پہ سیاہی کے دھبّے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ وہ اِن میں قلم کُھلا رکھ کر بھول

جاتا ہے' ہائے یہ مرد' اِن کے لیے قلم اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔

یہ قالینوں کی دکان کتنی دل نشین تھی' وہ چاہتی تھی کہ سارے قالین خرید کر انہیں گھر کی زینت بنائے مگر فضول خرچی اس کے لیے سب سے قابلِ نفرت چیز تھی۔ ''میں ایک عورت ہوں' میں فضول خرچی نہیں کر سکتی''۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور آگے چل دی۔

''اف یہ موچی...''۔ ایک کنارے بیٹھا ہوا موچی اسے دنیا کا سب سے غریب ترین آدمی لگ رہا تھا جس نے کبھی اپنے جوتوں کو نہیں سیا تھا' اس کے الجھے ہوئے بالوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اِنہیں کبھی سلجھا نہیں پائے گا۔ اس کی ننھی ننھی بیٹیاں اس سے گڑیوں کا مطالبہ کرتی رہیں گی اور وہ انہیں کچھ نہیں دے سکے گا' اپنے الجھے ہوئے بالوں کے علاوہ۔ حتیٰ کہ ان کی ننھی ننھی پانچ چھ انچ کی جوتیاں بھی نہیں سی سکے گا۔ وہ روئیں گی' چلائیں گی شاید تب بھی نہیں۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر آگے چل دی۔

سب مرد برے بھی تو نہیں ہوتے' جیسے کہ یہ سبزی فروش جس کے لیے اس کی سبزیاں ایسا رزق ہے جو جانے سے آتا ہے۔ یہ مرد اسے اپنا باپ لگتا تھا جس کی کمر کی ہڈی کپڑوں کے پار بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس سے کلو بھنڈی' پاؤ ٹماٹر اور پانچ روپے کی سبز مرچیں لے لی تھیں۔ وہ انہیں پکا کر کسے کھلائے گی؟ وہ ہنسنے لگی۔

اس کی چادر پر لگا گوٹہ کتنا اداس لگ رہا تھا' وہ چادر جو اس کی ساس نے پہلوٹھی کی اولاد ہونے پر دی تھی۔ اس نے چادر مزید مضبوطی سے کھینچ کر چھوڑ دی۔

سامنے بیٹھی ہوئی بڑھیا سے اسے اپنی ماں کی یاد آئی جو جھولی پھیلائے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے جن کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا کیونکہ وہ کسی سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ اس کی بوڑھی گردن کا خم اس کی چادر کی طرح اداس اور غمگین تھا۔

تھوڑا آگے چل کر ایک بیکری کے باہر اُسے ایک نہایت معصوم اور خوبصورت بچہ نظر آیا وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں بلّا اور گیند تھی۔

''آپ کھیلو گے اِس سے؟''۔ کافی دیر اُسے تکنے کے بعد وہ مجبوراً بول پڑی۔

''نہیں۔'' وہ بچہ تھوڑی دور ہو کر بولا۔ جانے اُسے اُس بچے پہ اتنا پیار کیوں آ رہا تھا۔

''پھر؟ کون کھیلے گا؟''۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''ارسل اور واصل''۔ بچے نے ہلکا سا بلا گھما کر کہا۔

''آپ کیوں نہیں کھیلو گے؟''۔ اس نے پھر پوچھا۔

''میں دوسرے بلے سے کھیلتا ہوں''۔ بچہ نہایت معصومیت سے بولا۔ اس کے گالوں میں ایک پرکشش سی لالی تھی۔

''آپ سکول جاتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی''۔ بچہ بولا۔

''مجھے ABC سناؤ گے؟''۔ اُس نے کہا۔ بچے نے آخر تک ABC سنا دی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''۔ اس نے پھر پوچھا۔

''آفاق''۔ بچے نے ہلکی سی مسرت سے کہا۔

''اتنا خوبصورت نام' ماشاء اللہ۔ یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''میری امی اندر بیکری میں ہیں''۔ بچے نے اشارے سے بتایا۔

''ابو کے ساتھ آئے ہو؟''

''نہیں ابو تو فوت ہو گئے ہیں''۔ بچے نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ اتنے معصوم اور خوبصورت بچے کا باپ کیسے مر سکتا ہے؟ سارے مرد ایک ہی جیسے بے وفا ہیں' کیا اتنے چھوٹے بچے کو چھوڑ کر اُس مرد کا مر جانا ضروری تھا؟

کیا اسے ذرا سا بھی خیال تھا کہ اُس کے مر جانے کے بعد آفاق کا کیا ہو گا؟ اس کی بیوہ کا جسے چار و نا چار ضرورت کا سامان لینے بازار کے چکر کاٹنا پڑتے ہیں۔ اور یہ غیرت مند بیوہ کبھی دوسرے مرد سے شادی نہیں کرے گی کیونکہ سوتیلا باپ دے کر وہ اِن بچوں کو خود سے دور نہیں کر سکتی' ہاں مگر وہ اپنے خاوند کی جگہ مرتی تو وہ مرد انہیں 'مامتا' سے کبھی محروم نہ ہونے دیتا۔ اُس نے آفاق کی جیب میں ہزار کا نوٹ ڈال دیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنی ماں کو گھر جا کر اِس کے بارے میں بتائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ اپنی چادر کو کھینچ کر رکھنا بھول گئی تھی۔ ''میں کیسی عورت ہوں؟'' وہ سوچنے لگی۔ میری ساس کی آنکھیں بند ہوتے ہی میرے خاوند نے مجھے طلاق دیدی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سارے مرد برے ہیں۔ مجھے گھر سے نکال کر میرا بچہ لے لیا' کون جانتا تھا کہ نئی آنے والی اسے اولاد دے سکے گی یا نہیں' اگر وہ میری ساس کی زندگی میں مجھے طلاق دیتا تو ساری جائیداد سے محروم ہو جاتا... میں بس ایسی عورت ہوں' جس کا آفاق اُس سے چھن گیا تھا' میں یتیم اور مسکین ہوں' میرا اکلوتا بھائی مجھے نہیں رکھ سکتا کیونکہ میں دفتر میں کام کرتی ہوں جہاں کا عملہ مجھے اُن نظروں سے دیکھتا ہے جیسے میں عُریاں ہوں' میں زرق برق لباس نہیں پہن سکتی کیونکہ میں طلاق شدہ ہوں' کیونکہ میں اکیلی رہتی ہوں... میں اکیلی عورت ہوں' میرے ماضی کے ساتھ مجھ سے کوئی شادی نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کے لیے طلاق کی یہ وجہ کافی نہیں کہ میرا خاوند جائیداد نہ ملنے کے ڈر سے اپنی پسند کی شادی نہ کر سکا... آہ! میں ایک عورت ہوں۔''

اس کی چادر مزید ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ الٹے قدموں واپس آئی جہاں وہ بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس نے خاموشی سے کلو بھنڈی' پاؤ ٹماٹر اور پانچ روپے کی سبز مرچیں اس کی جھولی میں ڈال دیں' بڑھیا نے حیرت سے اوپر دیکھا' وہ بڑھیا کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''مجھے سبزیوں سے نفرت ہے''۔ بڑھیا نے منہ پھیر کر کہا۔

''یہ تمہارے لیے ہیں خالہ۔'' اس نے بڑھیا کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے بیٹے نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ وہ ایک سبزی فروش تھا۔'' بڑھیا نے آہستگی سے کہا۔'' اسی بازار میں اُس کی دکان ہے... بس چار پانچ گلیاں چھوڑ کر...''

''میں شاید وہیں سے سبزی لے آئی۔ مجھے معلوم نہ تھا خالہ۔'' اس نے چپکے سے سبزی کی تھیلیاں اٹھائیں اور سوئے ہوئے موچی کے پاس رکھ آئی' کچھ سموسے خرید کر بڑھیا کو دے دیئے اور کچھ اپنے ساتھ لیے چادر سمیٹے آہستہ آہستہ چلنے لگی' کسے معلوم تھا کہ یہ سموسے بھی اُس کے ساتھ گھر تک جا سکیں گے یا نہیں؟

اس کے پرس میں غالباً اتنے پیسے جمع تھے کہ اگلی تنخواہ ملنے تک وہ روکھی سوکھی کھا سکتی تھی...

اسد طارق، SEECS

دِل کی بات

جمعے کا دن تھا، 30 اور 31 دسمبر کی درمیانی رات اور سردی اپنے عروج پر تھی۔ میں مارکیٹ سے سامان لے کر واپس اپنے ہاسٹل جا رہا تھا۔ راستے میں اسٹوڈیو پڑتا تھا۔ اُن دنوں میں اِس ریڈیو چینل میں بطور آر جے کام کرتا تھا۔ میری ایم اے کی ڈگری ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اور میں اسلام آباد میں ایک ہاسٹل میں رہتا تھا۔

جب میں اسٹوڈیو میں داخل ہوا، اُس وقت بارہ بج کر پچاس منٹ ہو چکے تھے اور وہ ''دل کی بات'' کے نام سے اپنا شو کرنے میں مصروف تھی۔ میں اُس کے رُوم کے باہر ہی ٹھہر گیا اور کھڑکی سے اُس کو دیکھنے لگا۔ اُس وقت گانا لگا ہوا تھا۔

''گھر آیا ہے اک مہمان حسین... ڈر ہے کہ چلا نہ جائے کہیں... ہم دل کی بات بتا نہ سکیں... اے ابرِ کرم... اے ابرِ کرم...!

''ویلکم بیک ٹو دی شو۔ میں ہوں آر جے رِیا اور آپ کے ساتھ ہوں دِل کی بات لے کر۔ ابھی آپ سن رہے تھے ''ابرِ کرم'' جو کہ گانا ہے فلم ''نصیب اپنا اپنا'' کا اور آواز تھی احمد رُشدی کی۔ بے شک ایک بڑا نام ہے موسیقی کی دنیا میں وحید مراد پر فلمایا گیا یہ گانا اِن کے مشہور ترین گانوں میں سے ایک ہے۔ مگر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت بالکل نہیں ہے، کیونکہ اگر آپ اپنے دل کی بات کسی کو بتا نہ سکیں، کسی سے کہہ نہ سکیں تو ہم یہاں آپ کے دل کے لیے ہی ہیں۔ اِس شو کے ذریعے آپ پہنچا سکتے ہیں آپ کے اپنوں، آپ کے پیاروں تک آپ کے دل کی بات۔ ہمارا ساتھ اب کچھ نو ساڑھے نو منٹ کا ہی رہ گیا ہے تو اب میں شامل کروں گی، جلدی سے، آپ کے وہ پیغامات جو آپ نے ہمیں بھیجے ہیں۔ ڈی کے بی (DKB) یعنی... تھری فائیو ٹو پر۔

پہلا میسج ہے مریم کا۔

''السلام علیکم رِیا باجی۔'' وعلیکم السلام مریم۔

''آپ کیسی ہیں؟'' میں بالکل ٹھیک ٹھاک، مزے میں۔

''میں اپنی دوست شبانہ سے سوری کہنا چاہتی ہوں کہ میں اُس کی شادی میں نہیں جا سکی۔ میرے پیپرز چل رہے تھے، میں کیا کرتی؟ پلیز مان جاؤ''۔ دیکھیں شبانہ آپ کی دوست آپ سے کتنی نادم ہے۔ ہر انسان کے بس میں نہیں ہوتا سب کچھ۔ کبھی کبھار ایسے مرحلے آ جاتے ہیں کہ انسان کو دکھ پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے آپ کی شادی پر اگر آپ کے دوست آپ کے چاہنے والے ساتھ نہ ہوں تو بہت برا لگتا ہے۔ تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ واقعتاً مجبور ہوں، اس لیے آپ مان جائیں مریم سے۔''

''اوکے اگلا میسج۔

ہیلو رِیا ہائے۔

''ہاؤ آر یُو'' آئے ایم فائن

یور شو از گڈ تھینک یُو

''آئے وانٹیڈ کہ آپ مائرہ تک میرا میسج پہنچا دیں کہ آئی وِل بی ویٹنگ فار ہَر۔ اُسی پارک میں مَیں اپنا اگلا سال اُسی کے ساتھ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ یوجَسٹ بی دیئر۔''

''واؤ... جی مائرہ' تو بس آپ' پہنچ جایئے گا وہاں جہاں کا کہا ہے انہوں نے نام... نام... وام تو لکھا ہی نہیں انہوں نے اپنا۔ چلیں جو بھی ہے آپ سمجھ تو گئی ہوں گی۔ ویسے مجھے ایسا کہنا تو نہیں چاہیے' سوچتے ہوئے کہ آج کل جو چل رہا ہے رواج۔ بس میک شور کہ آپ کے گھر والوں کو پتہ ہو کہ آپ کہاں ہیں اور کس کے ساتھ ہیں۔ لوگ آج کل اتنا سوچتے نہیں ہیں' اور بہت ایزی لے لیتے ہیں اس بات کو بَٹ آئی تھنک کہ پیرنٹس کو ہمیشہ انوالو رکھنا چاہیے۔ اس سے کافی آسانی رہتی ہے آگے بھی' خیر آپ کی جیسے مرضی...''

''ہمارا لاسٹ میسج ہے' کیوں کہ اب وقت بالکل ختم ہونے والا ہے ان صاحب نے بھی اپنا نام نہیں لکھا۔

''سلام ٹو یُو رِیا'' وعلیکم السلام۔

''میں کل آپ کے پروگرام میں کال کروں گا۔ دعا کیجئے کہ مل جائے۔ کسی کے لیے پیغام دینا ہے ضروری''

ہاں جی ضرور' ہم انتظار کریں گے اور دعا کریں گے کہ آپ کی کال مل جائے تا کہ آپ کا پیغام ہم پہنچا سکیں جن تک آپ چاہیں۔ اور میسج اب''

وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔

لینے ہیں یا نہیں؟'' میں مسکرا کر اُسے دیکھنے لگا تو اُس نے اپنا مائیک آف کر کے مجھے آواز دی۔

''بولو احمد'' میں نے سر ہلا کر منع کر دیا۔ اُس نے مائیک اون کر لیا۔

''نہیں لیں گے جی' وقت ختم ہونے کو ہے۔ آپ کا اور ہمارا ساتھ آج کے لیے بس اتنا ہی تھا۔ کل ملتے ہیں نیو ایئر کے ساتھ۔ کل کافی مزے کا دن ہونے والا ہے۔ نیا سال ہے' نئے لوگ' نئے مواقع' نئے تجربات ہوں گے۔ بس دعا یہ ہے کہ سب کے لیے سب بہتر ہو۔ پروگرام کا وقت ختم۔ مجھے دیجیے اجازت۔ اللہ حافظ' شب بخیر۔ السلام علیکم''

شو ختم ہوا۔ اُس نے اپنا ہیڈ فون اُتار کر رکھا اور سِیٹ سے ٹیک لگا کر لمبی سانس لی۔

''کیسا رہا؟'' اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''جیسا ہوتا ہے ہمیشہ' بہت اعلیٰ تم جانتی ہو کہ یہ چینل چلتا ہی تمہاری وجہ سے ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔

''وہ تو پتہ ہے مجھے۔ خیر ہاسٹل تک ساتھ چلو گے؟ رات بہت ہو چکی ہے اور میں اکیلی نہیں جا سکتی...''

''ہاں ہاں پتہ ہے۔ اب ہماری جان پہچان کو مہینہ ہو چکا ہے۔ کیا ہر دفعہ دہراؤ گی یہ بات؟'' ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اتنا تکلف دوستی کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔''

اُس نے ایک گہرا سانس لیا' پھر مسکرا کر بولی ''اچھا اچھا اب چلو۔''

ہم دونوں سٹوڈیو سے باہر آ گئے اور ساتھ چلنے لگے۔

کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر میں نے بات شروع کی۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے' وہ میسج والا کال کرے گا کل؟

''کون میسج والا؟''

''ارے وہی جس کا میسج پڑھا ابھی شو میں۔''

''اوہ اچھا' وہ؟''

''ہاں نا کرے گا کال؟''

''پتہ نہیں۔کل تو بہت لوگ کال کرنے والے ہیں۔ نیو ایئر کی پہلی رات۔''ثریا ہنسنے لگی۔''سب لوگ مچل رہے ہوتے ہیں بات کرنے کو۔''

اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔''

''ہاں!ہاں! کیوں نہیں۔کال کرہی لے گا وہ بھی۔''

''اُس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کال کرے گا تو ملے گی بھی یا نہیں! اب ہر ایک کے نصیب میں تو نہیں ہوتا نیو ایئر پر مجھ سے بات ہو جائے۔''

ہم دونوں پھر سے ہنسنے لگے۔کچھ دیر خاموشی کے بعد میں بولا:۔

''ویسے تمہارا دل نہیں کرتا؟ کہ تمہارے لیے بھی کوئی خاص ہو! جس سے ایسے اپنی فیلنگز شیئر کرو؟

''بابا!احمد'خیر تو ہے؟''

''ہاں ہاں!اب اس میں کیا بات ہے؟''

''نہیں'ایسی کوئی بات نہیں ہے بس...''ثریا مسکرانے لگی۔

''بس کیا؟''

''بس یہ کہ تمہیں لگتا ہے کہ کوئی ہوگا؟''

''ہاں'ہو بھی سکتا ہے!''

''ہو بھی سکتا ہے؟''ثریا نے قہقہہ لگایا''مجھ کالی کلوٹی کے ساتھ؟ بھاگ نہیں جائے گا مجھے چھوڑ کر دو دِن میں؟''

''ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں''

''ایسا لگتا ہے کیونکہ ایسا ہے۔یار خود دیکھو'یہ پیار ویار ایسے ہی سب لوگوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔

کسی کو دیکھا'اچھا لگا'پیار ہو گیا

''تو؟''

''تو یہ کہ میرے سلسلے میں تو سُوئی صرف دیکھنے پر آ کر اٹک جاتی ہے' اور وہ بھی''مسکراتے ہوئے''کوئی زیادہ دیر نہیں لگاتا ہوگا۔''

میں چپ ہو گیا'اور کچھ دیر تک وہ بھی کچھ نہیں بولی۔پھر کہتی ہے

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں؟''گھبرا کر کہا''نہیں'ویسے ہی۔''

''اچھا!خیر'میرا ہاسٹل آ گیا ہے۔''

''اوہ ہاں!''مجھے جیسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

''تھینکس۔اب یہ نہ کہہ دینا کہ تکلف کر رہی ہوں۔''

ہم دونوں مسکرانے لگے۔

''جی میڈم۔جو حکم آپ کا''

''چلو رات بہت ہو گئی ہے'سردی بھی بہت ہے۔تم بھی جاؤ اب۔شب بخیر''

''اچھا صحیح ہے۔خدا حافظ۔''

اُس کا نام ثریا تھا۔وہ میڈیکل کی طالبہ تھی اور میری ہی طرح پڑھائی کے ساتھ ساتھ کچھ آمدنی کے لیے آرجے کا کام کر رہی تھی۔ ہماری جان پہچان کو ہوا تو مہینہ ہی تھا مگر ہماری دوستی بہت گہری ہو چکی تھی۔سچ بات تو یہ ہے کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مَیں اُس کو پسند بھی کرنے لگا تھا۔ بس اس بات کا تہیہ نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ احساس عارضی ہے یا مستقل۔

اب وہ اپنے ہاسٹل میں داخل ہو رہی تھی اور میں وہیں کھڑا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا''یہ لڑکی بھی کتنی پاگل ہے۔بھلا ایسے تھوڑا ہی پیار ہو جاتا ہے۔شکل صورت سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟ یا شاید واقعتاً فرق پڑتا ہے۔

شاید ایسے ہی ہوتا ہے پیار' ایسے ہی لوگ پسند آ جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ ثریا میری بھی تو اچھی دوست ہے۔ میں نے تو اِس کو کبھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ایک ہی صورت اگر مجھے پسند ہے اور دنیا کو نہیں تو خلل کس کی نظر میں ہے؟ کون ہے جو لوگوں کو پرکھنا صحیح طریقے سے جانتا ہے؟ کسی کی نظر جو بھی کہے مجھے تو ثریا پسند ہے۔

یہ سوچ کر میں کچھ دیر کو ٹھہر گیا۔ پھر سوچا

''تو کیا مجھے ثریا سے شادی کر لینی چاہیے؟''

یہاں آ کر میں خاموش ہو گیا۔ جیسے سب کچھ تھم سا گیا ہو۔ میں لگاتار ثریا کے کمرے کی طرف دیکھتا رہا اور اپنے دل میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنے لگا۔ اچانک اُس کے کمرے میں روشنی ہوئی اور میں چونک گیا۔ پھر بھی ٹکٹکی باندھے اُسی کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے خیالات' بلکہ خواہشات کے بالکل برعکس وہ کھڑکی پر نہیں آئی اور پھر سے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ اِس کے بعد میں اپنا سا منہ لے کر اپنے ہاسٹل کی جانب چل دیا۔

میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ایاز ابھی جاگ رہا تھا' لیکن اپنے بستر پر رضائی میں منہ دے کر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی بتی بند تھی۔ میں نے اندر جا کر بتی جلائی تو رضائی میں سے اپنی شکل باہر نکالی اور بولا

''مر گئے آپ آخر کار؟''

''ہاں یار!''

''کدھر مر گیا تھا؟ ایک بج رہا ہے۔''

''وہ میں اسٹوڈیو رُک گیا تھا... مارکیٹ سے واپسی پر۔''

''جی اندازہ ہو گیا تھا مجھے۔''

میں اپنے بستر پر بیٹھ کر جوتے اُتارنے لگا۔ اتنے میں ایاز صاحب نے آرام سے اپنے پلنگ کے پچھلے حصے سے ٹیک لگائی اور مجھے دیکھنے لگے۔

''تو پھر؟''

''پھر کیا؟''

''اسٹوڈیو گئے اور پھر؟''

''ہاں وہاں بس رُکا اور پھر...''

''ہاسٹل تک چھوڑا؟''

''کس کو؟''

''مجھے!'' ایاز چڑ کر بولا ''ارے بھئی بھابھی کو...''

''کون بھابھی''

ایاز نے اپنا ہاتھ نہایت چڑ کر اپنے ماتھے پر مارا اور مجھے دیکھا۔

''جا یار تُو نہ بتا'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

''ہاں چھوڑ آیا' خوش؟''

''بہت!''

''پتہ نہیں کیا بے چینی لگی رہی ہے تجھے!'' میں نے اُٹھ کر جوتے ایک طرف کیے اور غسل خانے جا کر چہرے پر ٹھنڈے پانی کا چھٹا مارا۔

''ہاں بھئی کیا کریں۔ بھائی تو ماں سمان ہوتا ہے۔''

میری بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔

''اچھا اب کافی بکواس نہیں ہو گئی؟''

''نہ جی نہ! ابھی تو شروع ہوئی ہے''

میں باہر آ کر واپس اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

''اچھا بول۔''

''بتا نا''

''کیا؟''

''کیا ہوا؟''

''نہیں یار ایسا تو کچھ نہیں...''

''اچھا'' ایاز ہنستے ہوئے بولا'' تو پھر میں اِس اُڑی اُڑی سی رنگت سے کیا اندازہ لگاؤں؟''

''ایک کام کر بھائی' تُو نہ لگا اندازے۔''

''اچھا تو پھر بتا۔''

''یار بس وہی' میری شکل ایسی ہے میرا رنگ ویسا ہے۔ مجھ سے کون پیار کرے گا؟''

''تو تُو نے لبیک دل میں ہی پڑھا کیا؟''

''پاگل مت بن یار'' مجھے اُس کی بات کچھ بری لگی۔

''نہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ تُو نے نہیں کرنی شادی؟''

میں نے منہ بنا کر ٹانگیں بستر پر کیں اور رضائی اوپر کر لی۔

''بتانا! نہیں کرنی کیا؟''

''کرنی ہے ظاہر ہے۔''

''اور تجھے پسند بھی ہے ثریّا؟''

''پسند؟ یار مطلب اچھی دوست ہے لیکن میں نے کبھی''

''اُس کو'' اُس'' نظر سے نہیں دیکھا؟'' ایاز ہنسنے لگا۔'' او بھائی'' اُس میں کتنی دیر لگتی ہے؟'' اگر تُو چاہتا ہے تو اِس میں برائی کیا ہے؟''

''یار...''

''کیا یار؟ پہلے خود تو کسی نتیجے پر پہنچ جا۔ چلا ہے اُس کو نصیحتیں کرنے۔''

یہ کہہ کر ایاز دوبارہ رضائی میں گھس گیا۔

''چل اب لائٹ آف کر اور سو جا۔ اتنا نہ سوچ۔''

میں نے اُٹھ کر بتی بُجھائی اور آ کر لیٹ گیا۔ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا ایاز نے۔ مطلب اگر ایک آدھ دفعہ کوشش کر لوں تو کیا جاتا ہے؟ یہ سوچ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور دائیں طرف کروٹ لی اور اونگھنے لگا۔

اگلے دن' 31 دسمبر کو' میں رات بارہ بجنے سے کچھ تین چار منٹ پہلے پہنچ گیا۔ سوچا کہ ثریّا کو اس دفعہ نیو ایئر وش کرتے ہیں' خوش ہو جائے گی۔ میں اُس کے روم کی طرف بڑھا۔ میں باہر کھڑکی سے اُس کو دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

''جی تو ہمارے نیکسٹ کالر کا نام ہے... ارسلان' راول پنڈی سے انہوں نے کال کی ہے۔ جی ارسلان' السلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔ رِیا؟''

''جی''

''آئی لو یو''

ثریا ایک مختصر سے لمحے کو ٹھہر گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''جی بہت شکریہ! آپ لوگوں کا یہی پیار ہے جو...''

ارسلان ثریا کی بات کاٹتے ہوئے بولنے لگا۔

''نہیں۔ میں سچ مچ آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں وہی ہوں جس نے کل رات کے شو میں آپ کو میسج بھی کیا تھا''

ثریا خاموش ہو گئی۔ اب کی بار خاموشی خاصی طویل تھی۔ میرے بھی پسینے

چھوٹنے لگے۔ پھر ارسلان بولا۔

''ہیپی نیو ایئر''

اور اس کے ساتھ ہی گھڑی پر بھی میری ہی طرح بارہ بج گئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب سچ ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اب تک آپریٹر کال کاٹ چکا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

''ہیلو؟''

''جی'' ثریا نے کپکپا کر جواب دیا۔

''کیا ہوا؟''

''نہیں کچھ نہیں وہ...'' ثریا مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے چہرے پر جیسے کوئی جواب ڈھونڈ رہی ہو۔ مگر میرے چہرے پر حیرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ثریا بھی بظاہر تو مجھے حیران لگی مگر اُس کی آنکھوں سے ایک عجیب سی دلچسپی چھلک رہی ہو جیسے اُس کو یہ سب پسند آ رہا ہو۔ میں سَر جُھکا کر اُس کے رُوم سے باہر آ گیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔ دو تین منٹ بعد ثریا باہر آئی وہ خوش تھی۔ میری طرف دیکھا اور میرے کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس وقت جیسے میرے ذہن میں سو سوال گُھوم رہے تھے۔ مگر جب میں نے منہ کھولا تو بس یہی کہہ سکا۔

''یہ کیا تھا؟''

وہ ہنسنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے جذبات اُس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ پھر کہنے لگی۔

''پتہ نہیں۔ میں نے بولا ہے آپریٹر کو نمبر لکھوا دے''

''تم نے کیا کیا ہے؟'' میں نے چونک کر کافی تلخ لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب کیا کِیا ہے؟ وہ اتنا اصرار کر رہا تھا۔ ایسے ہی تھوڑی میں اُس کو منع کر دیتی۔ اُس نے مجھے میری آواز سے پسند کیا ہے۔ زیادہ کچھ تو ہونے والا ہے نہیں۔ تھوڑا بہت تو اِنجوائے کر ہی سکتی ہوں نا میں بھی''

میں اُس کا چہرہ دیکھتا رہا اس کے چپ کرنے کے دو تین سیکنڈ بعد میں مڑا اور اسٹوڈیو سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر آسمان کو دیکھ کر اللہ سے پوچھا ''یہ کیا تھا؟'' اور پھر ہاسٹل کی طرف چل پڑا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو ایاز جاگ رہا تھا۔ میں نے ذرا غیر معمولی تیزی سے دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' ایاز نے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے ایاز کو ساری کہانی سنائی۔ ایاز پہلے تو ہنسنے لگا۔ میں نے اُس کو گُھورا تو وہ کچھ سنجیدہ ہوا۔

''تو اب اس میں مسئلہ کیا ہے؟''

''یار مطلب کوئی طریقہ ہوتا ہے ایسے ہی کسی کے جذبات سے کھیلنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''کون کس کے جذبات سے کھیل رہا ہے؟''

''ثریا کھیل رہی ہے اُس فون والے کے جذبات سے۔ وہ کیا نام تھا اُس کا... ارسلان'' ارسلان!''

''ہاں اب یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ یونہی کسی سے بات کرنے لگ جانا''

''تو بھائی کیسے شروع ہوتی ہے بات چیت؟ عجیب بچوں والی بات کر رہا ہے۔ اور اُس نے خود اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ تو اِس میں ثریا کا کیا قصُور؟''

''یار مطلب مشورہ تو کر لیتا ہے نا بندہ۔''

''تو اُس نے تیری طرف دیکھا تو تھا۔ تُو منع کر دیتا۔ اور ویسے بھی تُو کون

ہوتا ہے اُس کو مشورہ دینے والا؟''

''اُس کا دوست''

''جا یار دوست! دوست ہے تو اُس کی خوشی میں خوش ہو جاتا''

''او بھائی وہ بندہ ثریا کو صرف آواز سے جانتا ہے۔ شکل دیکھے گا تو...''

''شکل دیکھے گا تو کیا؟''

تھوڑی دیر کے لیے مجھے چپ لگ گئی۔ پھر میں بولا۔

''شکل دیکھے گا تو انکار کر دے گا۔''

''اب تُو ثریا کی صورت پر باتیں بنا رہا ہے۔''

او میرا وہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب وہ ثریا کو پسند کرے' ایسا ضروری تو نہیں''

''تو نا پسند کرے' ایسا کون سا ضروری ہے؟ تُو پسند کرتا ہے تو وہ نہیں کر سکتا۔''

''پھر بھی یار''

''پھر بھی کیا؟''

میں نے ایک گہری سانس لی

''میں بھی پیار کرتا ہوں ثریا سے۔''

یہ سنتے ہی ایاز نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

''ہیں؟ اچھا اچھا! صحیح بات ہے''

''اب اس کا کیا مطلب؟''

''اس کا مطلب یہ کہ تو گھوم گیا ہے۔''

''تو وہ محبت کر سکتا ہے' میں نہیں کر سکتا۔''

''مجھے لگتا ہے اب یہ فیصلہ تیرے ہاتھ میں رہا ہی نہیں ہے۔ ثریا تجھے اپنا دوست سمجھتی ہے۔ وہ کبھی بھی نہیں ماننے والی۔''

''ابھی تو میں نے بتایا ہی نہیں ہے۔''

''کوئی فائدہ بھی نہیں ہونے والا بتا کر۔ تُو اپنے دل کی بات اپنے تک رکھ۔ اُس کو خود فیصلہ کرنے دے۔ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے وہ۔ اور ابھی تو بس ایک دفعہ بات ہوئی ہے۔ ایسے ہی دماغ خراب کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ چل سو جا''

ایاز نے لائٹ بند کی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں بھی سرہانے پر سر رکھ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے مکمل غور و فکر کا محور اس وقت ثریا اور اُس کے لیے میرے ابھرتے ہوئے جذبات تھے۔

کیا میں واقعی ثریا سے پیار کرتا ہوں۔ مطلب وہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ جس قدر ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں' کوئی اور کبھی ہمارے بیچ آ سکے گا۔ یار واقعتاً میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں صرف گھبراہٹ اور بے چینی میں یہ سب سوچنے لگا ہوں۔ وہ صرف میری دوست ہے' اور کچھ نہیں۔ اور ایسی بکواس سوچ کر میں نہ صرف ثریا کے فیصلوں میں دخل دوں گا' بلکہ اچھی بھلی دوستی بھی ختم کر دوں گا۔ ابھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کو کچھ بھی نہ ہو۔ کیا پتہ ارسلان بس کوئی ڈرامہ ہی ہو۔''

یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے پانچ دن میری ثریا سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اُس کا شو صرف جمعے اور ہفتے کی رات کو ہوتا تھا اس لیے اسٹوڈیو میں بھی ملاقات نہ ہوئی۔

جمعے کو دوبارہ جب میں مارکیٹ سے واپسی پر اسٹوڈیو پہنچا تو ثریا وہیں تھی۔ جب اُس کے رُوم میں پہنچا تو دیکھا کہ اُس کی رُوم میٹ فرح اُس کے ساتھ اندر بیٹھی تھی۔ میں نے وقت دیکھا تو تقریباً ساڑھے بارہ ہوئے

تھے۔مطلب شوختم نہیں ہوا تھا۔غالباً کمرشل بریک اشتہار یا گانا چل رہا تھا۔ میں کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔لیکن میرے آتے ہی دونوں میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ثریا مسکرائی اتنے میں فرح کھڑی ہوگئی۔

''میں چلتی ہوں اب۔جلدی شوختم کر کے' پہنچو ہاسٹل' وہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھ سے سلام کرتی ہوئی روم سے باہر چلی گئی۔ثریا بھی کھڑی ہوگئی۔

''کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک۔تم سناؤ۔کوئی نئی تازی!''

''نئی تازیاں تو بہت ہیں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ارسلان سے بات چیت ہو رہی ہے نا''

''اوہ'' میں مصنوعی سا مسکرایا۔''تو کیسے ہیں جناب؟''

''وہ بہت اچھا ہے۔مجھے کافی پسند کرتا ہے اور مجھے بھی کچھ کچھ پسند آنے لگا ہے'' میز پر پڑے کمپیوٹر پر اُس نے ایک تصویر کھولی۔

''یہ رہی اُس کی تصویر''

ایک لڑکا کسی پارک میں کالا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔وضع سے تو خاصا مہذّب معلوم ہوتا تھا۔

''واہ۔اور تمہیں کیسے پتہ کہ یہ وہی ہے''

''اب وہی ہوگا نا۔مجھے کوئی غلط تصویر کیوں بھیجے گا؟''

''تو بدلے میں اُس نے تم سے بھی تصویر مانگی ہوگی؟''

ثریا نے سر ہلا کر حامی بھری۔

''دی؟''

''ہاں۔'' ثریا مسکرائی مگر اپنی نہیں' فرح کی''

''کیا؟'' میں نے حیران ہو کر ثریا کو دیکھا۔''لیکن یہ تو دھوکا ہے۔''

''کوئی دھوکا نہیں ہے۔میں نے سوچا اپنی تصویر بھیجی تو وہ بات کرنا چھوڑ دے گا''

''تو اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ تم اُس سے جھوٹ بولو...''

''مگر وہ کہتا ہے اُس کو کوئی فرق پڑتا ہی نہیں ہے اس بات سے کہ میں کون ہوں' کیسی لگتی ہوں''

''تو پھر اپنی تصویر کیوں نہیں بھیجی؟ یہ کیسا امتحان لے رہی ہو اُس کا؟''

''پتہ نہیں۔اب جیسا بھی ہے۔یہی ہے۔خیر کہتا ہے اُس کے دوستوں کو بہت پسند آئی ہے تصویر۔''

''اور اُس کو؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ کہہ رہا ہے کہ اُس نے نہیں دیکھی''

''ہیں؟''

''پتہ نہیں۔'' اوئے جاؤ یہاں سے شو لگنے لگا ہے''

میں اُس کے رُوم سے باہر آ گیا۔مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس بات پر کیسے ری ایکٹ کروں۔ مجھے ثریا سے گھن اور اُس بے چارے پر ترس آنے لگا تھا۔کمال ہے مطلب اپنی تصویر ہی نہیں بھیجی۔ایک لڑکا چاہے جتنا بھی کہے تصویر سے کچھ نہ کچھ تو فرق پڑتا ہی ہے۔اور ویسے بھی اگر کسی میں لڑکیوں کے حسن کی نسبت سے ذرا سا بھی ذوق ہو تو فرح نہایت خوبصورت اور حسین لڑکی تھی۔کسی بھی شخص کو سونے کی اُمید دلا کر تانبا دے دینا کہاں کی شرافت ہے۔میں نے ایک دم دوڑ لگائی اور ثریا

کے ہاسٹل کے لیے نکلا۔ ہاسٹل کے دروازے کے بالکل نزدیک مجھے فرح دکھائی دی۔ میں نے اُس کو آواز دی۔

''فرح!''

وہ رک کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں بھاگ کر اُس کے پاس پہنچا اور نہایت غصے سے بولا۔

''یہ کیا مذاق ہے؟''

''مذاق؟ کیسا مذاق؟''

''یہی تصویر والا۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''مجھ سے تمیز سے بات کرو!'' فرح کچھ چڑ کر بولی۔

''تم یہاں ایک نہیں دو لوگوں کی زندگی کے ساتھ مذاق کر رہی ہو اور میں تم سے تمیز سے بات کروں؟''

''ایسا کیا کر دیا ہے میں نے؟ اُس نے مدد مانگی۔ میں نے کر دی۔ اور کس لیے ہوتے ہیں دوست؟''

''اس لیے تو نہیں ہوتے۔ اور مدد؟ اس میں کیا مدد کی تم نے؟ اُس کو منع کر دیتی تو ہوتی اُس کی مدد۔ اُسے اُس کی اپنی ذات صورت شکل کے ساتھ جینا سیکھنے دو۔ تم بلا وجہ اُس کا سہارا بن رہی ہو۔ ایک چلتی پھرتی جان کو بیساکھی کی عادت ڈال رہی ہو۔ وہ چلنا بھول جائے گی فرح! اور پھر جب یہ بیساکھی ٹوٹے گی تو جس اذیت سے وہ گزرے گی' اُس کا کچھ اندازہ ہے تمہیں۔'' فرح ندامت سے سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔ جیسے میرے دلائل نے اُس کو لاجواب کر دیا ہو۔ میں پھر بولنے لگا۔

''جب ارسلان جانے گا کہ وہ ثریا نہیں تم ہو تو کیا گزرے گی اُس پر؟''

اتنے میں مجھے ثریا بھاگتی ہوئی ہاسٹل کی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ رو رہی تھی وہ ذرا قریب پہنچی تو اس کی ہچکیوں نے فرح کو اُس کی طرف متوجہ کر لیا۔

''کیا ہوا؟'' فرح نے پوچھا اور اُس کی طرف بڑھی۔ مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے فرح کو رکنے کے لیے کہا۔ ہمارے پاس آ کر ٹھہری اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کی۔ ذرا سی سنبھلی تو بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''وہ تو نابینا ہے!''

حضرت آدمؑ

حضرت آدمؑ جب دنیا میں آئے تو ان کے پاؤں زمین پر اور سر آسمان سے چھو رہا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کا قد چھوٹا کر دیا۔ تقریباً (60) ساٹھ بالشت' حضرت آدمؑ کی خوراک کے لئے سات دانے گندم کے بھیجے گئے۔ جن کو آدمؑ نے زمین میں بو دیا۔ پھر ان سے گندم کی فصل تیار ہوگئی جو کہ آدمؑ کی خوراک کا ذریعہ بنی۔ یہ گندم اُسی درخت سے لی گئی تھی جس کے قریب جانے سے آدمؑ کو جنت میں منع کیا گیا تھا۔ آدمؑ نے تقریباً 960 سال کی عمر پائی۔ آدمؑ کی پیدائش اور رحلت جمعہ کے روز ہوئی۔ جب آدمؑ کی رحلت ہوئی تو آپ کی اولاد' اور اولاد کی اولاد ملا کر تقریباً چار لاکھ نفوس روئے زمین پر رہائش پذیر تھے۔ آدمؑ کی وفات کے ایک سال بعد دنیا کی تمام ماؤں کی ماں امّاں حوّا وفات پا گئیں۔ آدمؑ کی وفات کے بعد اُن کے معاملات کے نگران حضرت شیثؑ بنے۔ آپ بھی نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر پچاس صحیفے نازل فرمائے۔

ابی ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ انبیاء کتنے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے پھر سوال کیا یا رسول اللہ ان میں سے رسول کتنے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا 313 کی جماعت ہے۔ میں نے پھر عرض کیا کہ ان میں سے پہلے کون ہیں تو آپؐ نے فرمایا حضرت آدمؑ۔

حضرت آدمؑ کی کنیت اس دنیا میں ابوالبشر ہے اور آخرت میں ابو محمد ہوگی۔

(ماخوذ من قصص الانبیاء)

اویس عزیز' ایس ایم ایم ای

پُراسرار محبت

''محبت تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے۔ایک بار اس کے اندر داخل ہو جاؤ پھر باہر نہیں آنے دیتی۔ باہر اگر آ بھی جاؤ تو آنکھیں جنگل کی تاریکی کی عادی ہو جاتی ہیں کہ روشنی میں بھی کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔''

سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا چلتے چلتے اس نے مُڑ کر گھر کی طرف دیکھا یہ وہی گھر تھا جو اس کی جنت تھا اور آج یہی گھر ویران تھا۔ سیڑھیاں خاموش' دیواروں پر تصویروں کے نشیب و فراز' اور افراد' نجانے کہاں غائب ہو گئے۔ جیسے پورا گھر کسی آواز کو ترس رہا ہو۔

''بعض دفعہ انسان کو چہرے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی صرف آوازوں کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہو جو آپ کے وجود کے تمام ناسوروں کو نشتر کی طرح کاٹ پھینکے اور پھر بہت نرمی سے ہر گھاؤ کو سی دے''

کمرے میں اس کی تصویر خوبصورت کانچ کے فریم میں آویزاں تھی اور سوچنے لگی اور کچھ نہیں تو یہ تصویر ہی اپنے ساتھ لے جاؤں' اس نے تصویر اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آنکھوں میں سے کسی نے روشنی چھین لی ہو اور جیسے اپنے آپ کو ایک اندھے کنویں میں محسوس کر رہی ہو۔

''اُس نے پہلی بار اس چہرے کو دیکھا جس سے اس کو عشق... عشق تھا یا دیوانگی یا کچھ اور تھا... عشق تو انسان سے خدا نہیں چھڑواتا... لیکن میں نے چھوڑا تھا تو پھر کیا یہ عشق تھا؟ اگر عشق نہیں تھا تو کیا تھا'' وہ بے تابی سے جھک کر کرچیاں تلاش کرنے لگی مگر کرچیاں بھی سب غائب تھیں۔ کتنی محبت سے یہ تصویر تیار کروائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے سمندر بسا ہو اور بہنے کو ترس رہا ہو۔

سنسان گھر میں اس کے خالی اور کھوکھلے وجود کی سنسناہٹ صاف سنی جا سکتی تھی یا پھر تنہائی کی بے آواز سانسیں۔ اس نے اسی پل سوچا جن کے دل آباد نہ ہوں وہ اندر سے خالی خالی ہو جاتے ہیں اس نے الوداعی نظر ڈالی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے مگر یادیں زنجیر کی طرح اس کے قدموں سے لپٹ گئیں جو نہ جانے کب سے اس کے ساتھ وابستہ تھیں۔

نڈھال ہو کر اپنا وجود اس نے سیڑھیوں پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''میں زندگی میں پہلی بار دربارِ دل میں داخل ہو رہی تھی اور وہاں دل اپنے تخت پر بڑے اطمینان کے ساتھ براجمان تھا... عجیب سا غرور تھا اس کے وجود میں ... اور ہر کوئی گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا... صرف میں تھی جو اپنے پاؤں پر چل کر وہاں آئی تھی۔ شاید وہ سب بھی اپنے پاؤں پر چل کر آئے ہوں گے۔ صرف میں تھی جو اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ شاید وہ سب بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں گے... اور دل... اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی... تنی گردن' سیدھے کندھے' تخت کے ہاتھوں پر پھیلے بازو... اور وہ اپنے دربار میں بادشاہ تھا۔ وہ دربارِ دل تھا اور میں ... میں... آخر وہاں کیوں آئی تھی؟

کچھ دیر وہ یونہی ساکت بیٹھی رہی۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر اُس کا سٹڈی رُوم تھا وہ اٹھ کر اُس کے سٹڈی روم میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹا سا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا اور یہ کمرہ اس کی کل کائنات تھی۔ اپنا بیشتر وقت وہ یہیں گزارتا تھا۔ کمرے میں کتابیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ پاؤں دھرنے کی جگہ نہ تھی وہ بچتی بچاتی اس کے لکھنے پڑھنے کی میز تک جا پہنچی اور اچانک اس کے دل و دماغ سے ایک لہر گزری۔

''بھلا بتاؤ ہمارا مُنا کیسا ہو گا...؟ اس نے پینسل سے ایک خالی سکیچ بنا ڈالا تھا جس کی آنکھیں ہو بہو باپ کی سی اور پتلی سی ناک ماں جیسی تھی۔

اس کی عادت تھی وہ اپنی چیزوں کو سنبھال کر رکھتا تھا لیکن سب سے چھوٹا مُنا

اسے گڈمڈ کر دیتا اور خود بھی ایک بچہ بن جاتا اور عجیب وغریب حرکتیں کرتا اور وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہ جاتی۔ بچوں کے سکول جاتے ہی وہ ساڑھی کا پلو کمر میں اڑس کر گھر کی صفائی میں جٹ جاتی۔ بستر کی چادریں بدلتی تو اسے اس کی کھوئی ہوئی بہت سی چیزیں تکیے کے نیچے سے ملتیں۔ تب ان دیکھے خواب اٹھا کر وہ اپنی آنکھوں میں سجا لیتی۔ نامکمل خواہشیں' ادھوری خوشیاں اور کھوئی ہوئی چاہتیں صرف۔

اسے ہر پل اپنا وجود سمیٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس کی مانوس آنکھوں پر خوشبو بن کر چھا گیا تھا اس کے تن کی طرح اس کا من بھی بہتے پانیوں کا سا اجلا اور پاک صاف تھا وہ اسے حد سے زیادہ چاہتی تھی اس کی ناراضگی اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ جھٹ سے اسے منانے میں پہل کر ڈالتی' کبھی روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلائے رکھتا اور کبھی ہنس دیتا اور کبھی اس کے لمبے گھنے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا کر لاڈ سے کہتا۔

''تم میری عادتیں بگاڑ دو گی''

ایک طرف وہ ہر تلخ بات بُھلا کر اس کے پیار میں کھو جایا کرتی تھی۔ اُدھر کئی دنوں سے اسے عجیب دورے پڑنے لگے تھے۔ وہ اس کی بے پناہ محبت سے خوف کھانے لگا تھا۔ اور کہتا:

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہاری ذات کے خول میں قید ہو گیا ہوں اور یہ خیال رات دن میرا پیچھا کرتا ہے...

تمہاری آنکھیں ہر وقت میری نگرانی کرتی ہیں... تمہارا خیال مجھے راستہ دکھاتا ہے... تمہاری یہ عادت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے اس نے مجھے اپاہج بنا دیا ہے''

شب و روز بڑی کشمکش میں گزر رہے تھے وہ اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی تھی اور بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تیمارداری میں جٹ گئی تھی۔ ایک صبح وہ اس کی صحت یابی پلٹ آنے کی دعا مانگ کر جائے نماز سے اٹھی اور گیٹ سے اخبار اٹھا کر لائی' چائے کا پیالہ بنا کر ٹرے میں رکھا' وہ جانتی تھی کہ صبح اُٹھ کر اسے چائے کے ساتھ اخبار پڑھنے کی عادت ہے۔ اس نے بھی اس کو اپنی عادت ہی بنا لیا تھا۔ زبان ہلنے سے پہلے ہی اس کی تمام ضروریات پوری کر دیا کرتی تھی۔

کھڑکی میں کھڑا ہو کر وہ دور تک پھیلے ہوئے اودے اودے پہاڑوں کے سلسلوں میں نجانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

خاموشی سے چائے کی ٹرے اور اخبار میز پر رکھ کر بستر درست کرنے لگی۔ یکا یک اخبار ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہ بری طرح کانپنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور دوڑتی ہوئی آئی۔ کبھی اس کا ماتھا چومتی کبھی نبض دیکھتی۔ جیسے وہ اس کا چھوٹا منا ہو جو بیمار پڑ گیا ہو۔ وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ رہی تھی: ''تم ٹھیک تو ہو نا...؟''

ممتا اس کی آنکھوں سے امڈ رہی تھی۔

اس کے دونوں بازو پکڑے ہوئے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور کہنے لگا:

''تُم کیسی عورت ہو آخر تمہیں آج تک خفا ہونا نہیں آیا... انتقاماً بھی تم نفرت نہیں کر سکتیں... انا یا خودداری نام کی کوئی چیز نہیں ہے تم میں''

اس کا لہجہ سخت اور اونچا ہو گیا تھا... چٹاخ سے کوئی چیز اس کے پہلو میں جیسے ٹوٹ گئی ہو۔ تڑخنے کی یہ آواز اس کے اندر چیرتے ہوئے گزر گئی۔

''خوف آتا ہے مجھے تم سے اور تمہاری محبت سے... ایک دن تم بھی میرا یہی حشر کرو گی''

وہ خوفزدہ چہرے سے اخبار میں چھپی ہوئی کسی خبر کی طرف بار بار اشارہ کر رہا تھا کہ اچانک اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے کہ اسے محسوس ہوا جیسے وہ جہنم رسید ہو گئی ہو اور اس کے جسم سے کانٹے نکل رہے ہوں۔

سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں بھینچتے ہوئے وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پتھر کا بت بنی وہ دیکھتی ہی رہ گئی اور کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

اور جیسے ہی ہاتھ بڑھا کر اس نے اخبار اٹھایا تو دیکھا کہ اس میں ایک تصویر چھپی تھی جس کے نیچے لکھا تھا:

''ایک عورت کئی سال سے اپنے مردہ شوہر کی لاش لئے بیٹھی ہے اور اسے یقین نہیں کہ اس کا شوہر مر گیا ہے''

ابراھیم علی خان: ایم سی ایس

شناخت کا سفر

شام کے دھندلکے میں خستہ حال پینٹ کوٹ میں ملبوس فقیر' جس کا لباس بمشکل اس کا ستر چھپا پاتا تھا' بلب کی ٹمٹماتی روشنی تلے بیٹھا تھا۔ زمانے کی سختیوں کے نقوش اس کے بیمار چہرے سے روزِ روشن کی مانند عیاں تھے۔

وہ کبھی اس شہر کا سب سے مشہور انسان تھا۔ رئیسِ شہر کی اکلوتی اولاد' معروف ترین فنکار' جس کا نام ایک عالم جانتا تھا' جس جیسی زندگی جینے کی خواہش ہر دوسرا شخص کرتا تھا۔ دولت' شہرت' نام' خوبصورتی' سب اس کی دسترس میں تھا۔ ستائیس سال کی عمر میں اس نے عروج کی اس منزل کو چھوا تھا جسے پانے کے لئے کئی جنم درکار ہوتے ہیں۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی پر اس کی شناخت' اس کا نام' اس کا چہرہ' اس کے لئے وبالِ جان بن چکا تھا۔ اس کی ہر چھوٹی موٹی بات شہ سرخیوں کی صورت میں اخبارات کی زینت بنتی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ اخبار والے اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ گھر کے باہر رپورٹروں کا ڈیرہ رہتا تھا۔ دن کا چین' رات کی نیند چھن چکی تھی۔ وہ جہاں جاتا' لوگ آٹوگراف لینے کیلئے پیچھے پڑ جاتے' نظریں اس کا تعاقب کرنے لگتیں۔ ایک عام آدمی کی زندگی اس کا خواب بن چکی تھی۔ ڈپریشن نے اسے گھیر لیا تھا۔ 'فزیوتھراپی' کا بھی کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس دن تو حد ہی ہوگئی جب رپورٹروں نے اس کا گھر میں داخل ہونا ناممکن بنا دیا۔ وہ واپس گاڑی میں کسی نہ کسی طرح بیٹھا اور دور کسی انجان جگہ کی تلاش میں بھاگ نکلا' جہاں سب اس کی موجودگی سے بے پروا ہوں اور اگر کوئی اسے دیکھ بھی لے تو اس کا سایہ نہ بن جائے۔ اس نے گاڑی کو شہر سے دور جنگل کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ ہلکی آواز میں چلتا صوفیانہ کلام کسی نشے کا کام کر رہا تھا۔ یہی ایسی چیز تھی جو اذیت کے ان لمحات میں اسے سکون بخشتی تھی۔ پورے دن میں خوشی کے بس یہ چند پل ہی ہوتے تھے۔ جب وہ کوئی کلام سنتا تھا۔ سرور اس کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا تھا۔ اور وہ دماغی طور پر ہلکا ہو جاتا تھا۔ دن بھر کی الجھنیں مدھم پڑ جاتی تھیں۔ سب اذیتیں جو اس کے ذہن کو جکڑے ہوتی تھیں' بھاپ بن کے تحلیل ہو جاتی تھیں۔ صوفیانہ کلام اسے سارے عالم سے بے گانہ کر دیتا تھا۔ اگرچہ زندگی میں یکسانیت سے وہ اکتا جاتا تھا لیکن سارے رستے وہ ایک ہی کلام بار بار سنتا آیا۔

لوگوں نے پیچھا چھوڑا تو بادلوں نے تعاقب شروع کر دیا۔ جنگل تک پہنچتے پہنچتے' آسمان نے گہرے کالے بادلوں کی چادر اوڑھ لی۔ سورج بھی بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ سامنے شیشے پہ برستی بوندیں اترنے لگیں۔ جب شیشے کے پار دیکھنا ناممکن ہو گیا تو اس نے گاڑی سڑک کنارے روک لی۔

ہوا کے ساتھ بارش بھی تیزی پکڑنے لگی۔ وہ دروازہ کھول کے اترا اور گاڑی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس پل وہ ارمانی کے قیمتی پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا پر اپنے پیرہن کے بھیگنے سے وہ لاتعلق تھا۔ بلکہ زندگی میں پہلی

دفعہ اسے کسی بھی چیز کی فکر نہیں تھی۔ جس کیفیت میں وہ تھا' ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ آس پاس آبادی تھی نہ ٹریفک' یہ جگہ اس کے لئے نہایت موزوں تھی۔ ٹھیک اسی پل میں بجلی کڑکی جب ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیلی تھی۔ اگرچہ وہ خوبصورتی میں بے مثل تھا لیکن اس وقت وہ شیطان کا کوئی روپ دکھائی دیا۔ تیز ہوا نے اس کے بالوں کو بے ربط سا کر دیا تھا لیکن اس نے بھیگے بالوں کو چہرے سے ہٹانے کی قطعاً زحمت نہ کی۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ کے گرد باندھے' ایک ٹانگ دوسری پر ٹکائے' ہر چیز سے قطع تعلق اپنی نیلی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا سامنے افق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کا وجود تو یقیناً وہیں تھا پر وہ خود کہیں اور' اس کا جواب جاننا اس کے لیے بھی مشکل تھا۔ اس کے ایک طرف جنگل تھا تو دوسری طرف سنہرے کھیتوں کی تاحدِ نظر قطار۔ بتدریج کم ہوتی روشنی میں وہ کھیتوں کی قطار میں دور موجود کھمبے کو غیر ارادی طور پر تکنے لگا۔

ہوا نے اب فصلوں پہ قیامت ڈھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کسانوں کی محنت پہ زور و شور سے پانی پھرنے لگا۔ ایک کے بعد ایک کھیت پہ لگی فصل تیز ہوا اور بارش کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگی۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ اکیلا اس بربادی کا عینی شاہد تھا۔ اسے شدت سے اپنی بے بسی و لاچارگی کا احساس ہونے لگا۔ کتنا لاچار تھا وہ چاہ کر بھی کچھ کرنے سے قاصر۔ اس کے آزاد ہاتھوں کو بے بسی کی زنجیروں نے جکڑ رکھا تھا۔ باقی دنیا والوں کی طرح وہ بھی تماشائی تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے میں بادلوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ پر برستی بارش نے اس کے آنسوؤں کو خود میں سمو لیا۔ اس نے چہرے کا رخ اوپر کر کے آنکھیں بھینچ لیں۔ سالوں کا سفر لمحوں میں طے ہونے لگا۔ دو موٹے موٹے قطرے اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے زمین پہ جا گرے۔ اسی حالت میں وہ ان لوگوں کے حق میں دعا کرنے لگا جن کی سال بھر کی محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔ اگرچہ الفاظ بُننا محال ہو رہا تھا پر وہ پھر بھی فریاد کرتا رہا۔ برستی بارش نے گویا اس کی یادداشت بھی دھو دی تھی۔ چند منٹ کے سکوت کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آسمان سے کڑکڑاتا جواب آیا۔

اسے بارش سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ جس روز بارش ہوتی تھی وہ سارا دن گھر رہتا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں جب بھی بارش ہوتی تو وہ ہمیشہ بیمار پڑ جاتا۔ کڑکتی بجلی بھی ہمیشہ اسے ڈراتی آئی تھی۔ جب بچپن میں بجلی کڑکتی تھی تو اس کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ جاتا تھا۔ پھر اس وقت ہر چیز اس پہ بے اثر تھی۔ اپنے کپڑوں کی حفاظت میں کوئی کسر وہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اس کے بچپن کے کپڑے آج بھی نئے جیسی حالت میں تھے۔ لیکن اس دن شاید بے بسی و لاچارگی کے شدید احساس نے اسے دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیا تھا۔

وہ تب تک ویسے ہی بونٹ پہ بیٹھا رہا جب تک مکمل طور پر بھیگ نہ گیا۔ تیز ہوا نے بھیگے بدن پہ خاصا اثر چھوڑا تھا۔ بخار اس کے جسم میں انگڑائی لینے لگا۔ اسے دھیرے دھیرے بدن ٹوٹنے کا احساس ہونے لگا پر چہرہ سپاٹ تھا۔ کڑکتی بجلی سے ڈر کے خود کو کمرے میں بند کر لینے والا بچہ آج بالکل بے خوف تھا۔ اسے کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو ایک نظر دیکھا جو خود اپنی بے بسی پہ رو رہا تھا۔ ایک مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ اس نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نیا جنم ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جیب میں ڈال کے گاڑی کی چابی باہر نکالی۔ دروازے کے پاس پہنچ کے اس

نے دروازہ کھول کے چابی اندر پھینک دی۔ کالے بادلوں کے بوجھ تلے سورج کی روشنی دم توڑ چکی تھی۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ واپسی کا سفر طے کرنے لگے۔ گاڑی کے ساتھ ستائیس سال کا سفر بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ بارش کے ساتھ ہوا کا زور بھی ٹوٹنے لگا۔ سڑک کے اطراف میں لگی روشنیاں قطار در قطار اسے خوش آمدید کہنے کو روشن ہونے لگیں۔ اس کی شناخت گہرے تاریک جنگل نے نگل لی تھی اور نام بارش بہالے گئی تھی۔ وہ شہر کی جانب قدم بڑھاتا رہا۔ آہستہ آہستہ سرکتا سایہ شہر سے نزدیک اور سب سے دور ہوتا گیا۔ پُرمسرت زندگی کے سراب کو تاریکی نے نگل لیا تھا۔

پانچ روپے کا ایک سکّہ' فقیر کی پھٹی ہوئی جیب سے رستہ بنا کے زمین پر گر گیا۔ اس کے چھنکنے کی آواز نے سوچوں کے دریا میں غلطاں فقیر کو کنارے لگا دیا۔ ٹمٹماتی روشنی میں فقیر کے چہرے میں یہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

این سی احتشام قاضی : ایم سی ایس

تکمیل

اس کی کہانی بہت درد بھری تھی۔ سنتے وقت میری آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ یہ کہانی صرف اس کی نہیں بلکہ ہمارے تمام نوجوانوں کی ہے جو پاکستان سے مایوس ہو کر تلاشِ معاش کے لئے باہر جاتے ہیں وہاں شادیاں کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے ویزے کے لئے باپ نے کتنی زمینیں بیچیں ماں نے کتنا زیور بیچا۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہاں ان سے وابستہ کتنے لوگ ہیں جو ان کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں' کوئی ہوتا ہے جو اس امید سے سوتا ہے کہ شاید وہ اس کے خواب میں آ جائیں اور جاگتے اس امید سے ہیں شاید وہ لوٹ آئیں۔

وہ جب بھی لمبے سفر پر ہوتا تو اسے گھر اور بچوں کی فکر کھائے جاتی تھی لیکن اب کی بار گھر کی یاد ذرا نہ آئی۔ سفر کا ایک ایک لمحہ اسے صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو پلک جھپکنے میں اپنے گھر پہنچ جاتا گھڑی پر گزرتا ایک ایک سیکنڈ اس کے غم اور خوشی کی جنگ کو بڑھاتا چلا گیا۔ ماں سے ملنے کی خوشی اور کچھ انجانا سا غم جس سے اس کا دِل بیٹھتا چلا گیا۔ ایئر پورٹ پر اترا تو وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی ماں باہر اس کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ وہ یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے بغیر میری ذات ادھوری ہے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کے لئے روانہ ہوا۔ اسے یاد تھا کہ تین برس پہلے جب آخری دفعہ اس کی اپنی ماں سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس کی ماں کتنا روئی تھی۔ اس نے کتنی بار واپس آنے کو کہا تھا۔ اللہ نے ماں بھی کیا چیز بنائی ہے کہ جس کی محبت و شفقت سرحدوں کی پابند نہیں ہوتی۔ اور جسے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیسے جیتی ہیں وہ مائیں جن کے جگر کے

ٹکڑے ان کی نظروں سے دور اور ان کے لمس سے محروم ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ٹیکسی کچی آبادی میں داخل ہوئی۔ وہاں میلے کپڑوں میں مٹی میں کھیلتے بچے دیکھ کر اس کا سارا بچپن اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہی بچے، دوستی اور کھیل لیکن چہرے بدل گئے تھے۔ وہ ٹیکسی سے نکلا تو وہ اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ ہمت کر کے دروازہ کھولا تو ماضی کی یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ وہ چھوٹا سا صحن، ایک کمرہ، گھر کے در و دیوار چیخ چیخ کر اس سے سوال کر رہے تھے کہ آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی وہ لاجواب بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ اس کا بس چلتا تو اپنی ساری دولت، عزت، مقام بیچ کر واپس ماضی میں چلا جاتا۔ وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر رونا چاہتا تھا اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا یہ چاچا رہو کا ہاتھ تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ آنکھوں میں سوال پڑھ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

سارا راستہ دونوں بالکل خاموش رہے کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بوسیدہ گھر میں داخل ہوئے جہاں بہت سے والدین اپنے پیاروں کے انتظار میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہے تھے۔ ندامت کے باعث اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ وہ جس کی آنکھیں ماں کو دیکھنے کے لئے ترس گئی تھیں ماں کے چہرے کو دیکھے بغیر قدموں میں گر گیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ ماں کے ساتھ نظریں ملا سکے۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری زندگی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر گزار دے۔ اسے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ ہاتھ کی ٹھنڈک پورے جسم میں اترتی چلی گئی۔ اس کی نامکمل ذات مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے دِل کی خوشی اور اطمینان کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔

قبولیت کا خطرہ

قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی حج بیت اللہ پر اکٹھے تھے۔ حج پر جانے سے قبل ممتاز مفتی کو اِن کے کچھ دوستوں نے دعاؤں کی درخواست کی تھی۔ ممتاز مفتی نے یہ دعائیں ایک نوٹ بک میں درج کر لیں تا کہ بھول نہ جائیں۔ حج کے دوران جب بیت اللہ پر حاضری دی تو ممتاز مفتی نے نوٹ بک نکال لی تا کہ جِس جِس نے مخصوص دعاؤں کی درخواست کی تھی اُن کے لئے وہ دعائیں مانگ سکیں۔ ممتاز مفتی کے ہاتھ میں نوٹ بک دیکھ کر قدرت اللہ شہاب نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ممتاز مفتی نے نوٹ بک کی حقیقت بیان کی تو قدرت اللہ بولے:- دھیان کرنا یہاں جو دُعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔

ممتاز مفتی:-

''کیا مطلب؟'' میری ہنسی نکل گئی۔ ''کیا دعا قبول ہو جانے کا خطرہ ہے؟''

''ہاں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے''

میں نے حیرت سے قدرت کی طرف دیکھا۔

بولے ''اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹر ہیں۔ عرصہ دراز ہوا انہیں روز بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر حکیم، دید، ہومیوسب کا علاج کر دیکھا۔ کچھ افاقہ نہ ہوا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر چارپائی پر ڈال کر کسی درگاہ پر لے گئے۔ وہاں ایک مست سے کہا بابا دعا کر کہ انہیں بخار نہ چڑھے۔ انہیں آج تک پھر بخار نہیں چڑھا۔ اب چند سال سے ان کی گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی گردن ادھر ادھر ہلا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض صرف اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ انہیں بخار چڑھے۔ انہیں دھڑا دھڑ بخار چڑھنے کی دوائیاں کھلائی جا رہی ہیں مگر انہیں بخار نہیں چڑھتا۔

دعاؤں کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے اللہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ 'میرے اللہ! کیا کسی نے تیرا بھید پایا ہے''۔

(لبیک از ممتاز مفتی)

جی سی سعد احمد : ایم سی ایس

شناخت

تمہاری ہمت کیسے ہوئی' میری کتابوں کو چھونے کی؟ یہ کرخت آواز علی کی تھی' علی کی آواز سنتے ہی قاسم نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ کتاب واپس رکھ دی اور سہم کے کھڑا ہو گیا۔

اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ علی کی آواز پھر گونجی۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر' یہ سننا تھا اور قاسم اپنا سا منہ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

علی اور قاسم تھے تو ہم عمر مگر دونوں کی زندگیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ علی کے والد شہر کے رئیس تھے اور قاسم کے والد اس رئیس کے گھر میں مالی۔ قاسم کی ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ قاسم کے والد نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ اس کے والد اس کی دلجوئی کرتے' اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے' رات کو سونے سے پہلے پریوں کی دیس کی کہانیاں سناتے' اور اپنے باپ کی ہی تربیت کی بدولت قاسم کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو گیا تھا' اور باپ کی محبت اور انسانیت کے سبب اس کی فطرت میں یہ بات تھی کہ اس نے کبھی کسی ایسی چیز کی خواہش ہی نہ کی کہ جس کے حصول میں اس کے والد کو ذرہ بھر تکلیف اٹھانی پڑے۔ قاسم کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اور یہی وجہ تھی آج جب علی نے اسے اپنی کتابیں پڑھتے دیکھ کر ڈانٹا تو اُس کا دل بہت دُکھا۔ وہ واپس اپنے کوارٹر میں آ کر بستر پر اوندھا لیٹ گیا اور گھنٹوں اپنی قسمت پہ روتا رہا اور روتے روتے نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی' اور اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب اُس کے والد اُس کے سرہانے بیٹھے اس کا ماتھا اور بال سہلا رہے تھے۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سُوج چکی تھی' جب والد نے وجہ دریافت کی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا مگر اس نے اس سیلابی ریلے کو آنکھوں کی حد پار نہ کرنے دی اور ہمت کر کے بولا ''بابا کچھ نہیں بس سر میں درد کی وجہ سے آنکھوں میں بھی درد تھا۔ مگر اب سب ٹھیک ہے''۔ قاسم کو پتہ تھا کہ اس کے والد کی قلیل آمدنی میں کس طرح مشکل سے ان کا گزر بسر ہوتا ہے اور پھر بابا کی ٹی۔ بی کی دوائیاں بھی لینی ہوتی ہیں تو اس لیے چاہتے ہوئے بھی اس کے والد اسے سکول نہیں بھجوا سکتے۔

گردش لیل و نہار' بندش ماہ و سال دن رات کا ہیر پھیر کرتے رہے اور قاسم سولہ برس کا ایک خوبرو جوان بن گیا تھا۔ والد کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اُس نے ان کی جگہ کام شروع کر دیا تھا اور آج رئیس کے بنگلہ میں کافی چہل پہل تھی بنگلے کو برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا اور ہر طرف گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔

علی کے والد حاکم خان کو قومی اسمبلی کی نشست کی پارٹی ٹکٹ ملی تھی اور چند ہفتے بعد انتخابات بھی تھے سو حاکم خان نے یہ پارٹی آنے والے انتخابات کی تیاری اور شہر میں اپنے ووٹرز کو خوش کرنے کے لیے رکھوائی تھی کیونکہ دوسری طرف حاکم خان کے مخالف راجہ سکندر نے بھی انتخابی تیاریاں' بڑے زور و شور سے شروع کر رکھی تھیں۔

قاسم بڑی مستعدی اور پھرتی سے مہمانوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ حاکم خان تو ویسے بھی قاسم کو اس کے بچپن سے ہی جانتا تھا اور آج اسے اس طرح کام کرتے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ اسے انتخابات کے لیے اور سارے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ویسے بھی کسی جوان شخص

کی ضرورت تھی جو دن رات ایک کر کے اس کے لیے کام کرے چنانچہ رات کو فارغ ہو کر اس نے قاسم کو اس کام کی پیش کش کی۔ قاسم پیش کش سن کر بہت خوش ہوا' اس نے سوچا کہ وہ انتخابات میں حاکم خان کے لیے کام کرے گا اور وہ اسے کسی اچھے سے سکول میں داخل کروائے تا کہ اس کا تعلیم حاصل کرنے کا سپنا پورا ہو جائے۔ قاسم کو تو اس رات جیسے اپنی شناخت مل گئی تھی۔

انتخابات کے دن نزدیک آتے گئے اور قاسم جان مار کر حاکم خان کے لیے کام کرتا رہا' آج شہر میں دونوں جماعتوں کی انتخابی ریلی تھی' مخالفت کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کا بہت خدشہ تھا۔ دونوں جماعتوں کی ریلی شہر میں ایک ہی جگہ پر اختتام پذیر ہونا تھی اور وہ جگہ شہر کے عین وسط میں تھی۔ اس جگہ پر پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔ مقررہ وقت پر ادھر حاکم خان کے حامیوں کا جلوس امڈ آیا جس میں قاسم سب سے آگے آگے 'حاکم خان زندہ باد' کے نعرے لگاتا ہوا عوام کا جوش و خروش بڑھا رہا تھا اور دوسری طرف سے راجہ سکندر کے حامی اس کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

اختتام کی جگہ پر پہنچ کر دونوں طرف سے نعرے بازی اور بڑھ گئی اور پھر بات ایک دوسرے کو گالی گلوچ اور پھر ہاتھا پائی تک جا پہنچی' قاسم نے لڑائی جھگڑا چھڑوانے کی بہت کوشش کی مگر لوگ بہت زیادہ تھے' جب لڑائی مزید بڑھی اور توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو پولیس نے آنسو گیس کے شیل پھینکے اور ہوا میں فائرنگ کی' اس سے لوگ منتشر ہو گئے مگر اُسی اثنا میں پولیس کی ایک اندھی گولی قاسم کے سینے کے آر پار ہو گئی اور وہ موقع پہ ہی دم توڑ گیا اور عقب میں بھاگتے ہوئے لوگ ابھی تک نعرے لگا رہے تھے' ''حاکم خان زندہ باد' حاکم خان زندہ باد۔۔۔''

فلسطین کی ایک زخمی لڑکی کی پکار

ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا
تماشا دیکھنے والو!
میرے سر پیر دونوں
اس گھڑی ایک ساتھ زخمی ہیں
اِدھر دیکھو میرے مضبوط دونوں ہاتھ زخمی ہیں
میں گھائل ہوں
مگر اس بات کی میں اب بھی قائل ہوں
ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا
میری تو جان باقی ہے
میرا ایمان باقی ہے
مجھے معلوم ہے
سب مر گئے ہیں میرے گھر والے
بلند کرنے کو مل کر کلمہ حق دل جگر والے
ذرا یہ زخم میرے ٹھیک ہونے دو
میرے یہ ہاتھ دشمن کے ذرا نزدیک ہونے دو
میں دنیا کو دکھاؤں گی
بتاؤں گی
کہ بے شک دین حق کا ایک ہی قانون ہوتا ہے
کہ بدلہ خون کا ہر حال میں پھر خون ہوتا ہے
تماشا دیکھنے والو
جنازہ دیکھنے والو
جسے تم سوچتے ہو یہ ہے بس مسئلہ فلسطیں کا
نہیں ہرگز نہیں ایسا
حقیقت میں یہ مسئلہ ہے
میرے اسلام کے دیں کا
میری تو جان باقی ہے
میں اپنی جاں لٹاؤں گی
میں ہر خونی کا دیکھو خوں بہاؤں گی
بتاؤں گی
دکھاؤں گی
کسی کا گھر اُجڑنے سے
کسی پر کیا گزرتی ہے
ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا
ابھی بھی کچھ نہیں گزرا

(احسان علی دانش) سکردو

محمد عثمان اختر، این آئی سی ای

نظم

طبیعت ہے میری مائل سُخندانی پہ اے اختر
نہ ہو گر واسطے حق کے، تو میری گفتگو کیا ہے؟

ہو زیبِ تن اگر اِک پیرہن تعریف کے قابل
میں کیا جاؤں کسی کی حاجتِ دامن رفُو، کیا ہے؟

رَوا ہے معاملہ یہ ہی فلسطینی دلیروں سے
کہ اپنے تن میں خوں جانا، مگر ان کا لہُو کیا ہے؟

گُلستان میں اگر نخچیر بلبل کو اُڑا ڈالے
تو پیشِ گلشنِ دیگر، چمن کی آبرو کیا ہے؟

فلسطیں جل رہا ہے آتشِ نخوت میں اے مسلم!
اگر سینے میں دل ہے، پھر تغافُل کی یہ خُو کیا ہے؟

صدا اطفال کم سِن کی مجھے راتوں کو آتی ہے
''ہے یہ آہ و فغاں کیسی؟ لہو یہ چار سُو کیا ہے؟

صدائیں دل خراش، آہ و بُکا آتش فشاں جیسے
یہ شورش دل فگاراں کیا؟ یہ نالش کُو بہ کُو کیا ہے؟

سنا تھا اس مہینے میں نزولِ رحم ہوتا ہے
مگر یا رب! یہ رحمت جان لیوا رُوبرُو کیا ہے؟

نہ عیسیٰؑ ہی ہیں اترے، نہ کوئی دجّال آیا ہے
قیامت کا مگر مظہر، یہ منظر، ہُو بہُو، کیا ہے؟''

اثر دل پر اگر اب بھی یہ نالے کر نہیں سکتے
دَہر میں ہم سے پھر بڑھ کر کوئی بیداد خُو کیا ہے؟

یہ کیا مستی ہے جس میں اُمّتِ مسلم ہے خوابیدہ
رہا میخانہ ہی نہ جب تو پھر جام و سُبُو کیا ہے؟

اُٹھو، باندھے ہوئے سر سے کفن، بادہ کشو! اُٹھو
جو غافل از فغانِ دل کرے، وہ ہاؤ ہُو کیا ہے؟

فساد و فتنہ پر جو قفل با لب ہیں شریف النّفس
خموشی سے اُنہیں مقصود آخر، جستجو کیا ہے؟

اک آبِ تُند خُو بن کر ہمیں رستہ بنانا ہے
کہ کوہِ ظُلم کے آگے ذرا سی آبِ جُو کیا ہے؟

دلِ مردہ لیے بیٹھے رہے گر اپنے سینوں میں
کوئی شے اِس مسلمانی سے بڑھ کر پھر فرُو، کیا ہے؟

اس استبدادِ ظالم کے مخالف گر نہ اُٹھیں گے
صلوٰۃ و صوم میرا کیا؟ عبادات و وُضو کیا ہے؟

خداوند! گرچہ ہے مطلوب صبر اِس ماہِ رمضان میں
مگر رُسوائی امّت کی آخر آرزو کیا ہے؟

تہی دامن تیری نُصرت سے گر رہتی ہے یہ اُمّت
تو سوچ آخر جہاں میں ترجمانِ فکر ہُو کیا ہے؟

اگر امّت نہیں باقی، تو کیا جاؤں کہ مَیں کیا ہُوں؟
اگر امّت نہیں باقی تو تُو جانے کہ تُو کیا ہے!

* یہ نظم ماہِ رمضان میں لکھی گئی

محمد اعزاز تنویر' این بی ایس

... پھر کیسے بھلا سر کو اُٹھا کر چلے کوئی

جب بھوک یوں تہذیب کے آداب بھلا دے
جب سامنے ایواں کے کوئی جان گنوا دے
جب باپ ہو بیٹی ہی کی عصمت کا جواری
اور غیرت کے نام پر جو عزرائیل بنا ہو
پھر کیسے بھلا سر کو اٹھا کر چلے کوئی
پھر کیسے غمِ دل کو بھلا کر چلے کوئی
جب دُخترِ ملت کی صدا گونج رہی ہو
زمیں والوں سے نہ انصاف اسے حاکم سے ملا ہو
جب بھوک سے نازک طفل نڈھال پڑے ہوں
اور پدر پکارے کہ بیٹا ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
پھر کیسے بھلا سر کو اٹھا کر چلے کوئی
دل کیسے اس غم کو بھلا کر جیئے کوئی

جب ملک کے معمار کو پنشن نہ ملی ہو
اور ملک کے مسمار کو کرسی بھی عطا ہو
جب ملک کا عادل بھی عدل مانگ رہا ہو
اور ملک کا محسن بھی وفا مانگ رہا ہو
پھر کیسے بھلا سر کو اٹھا کر چلے کوئی
دل کیسے اس غم کو بھلا کر جیئے کوئی
جب ماں کے کلیجے کی آگ افق ہلا دے
وہ کون تھے ظالم جو میرے لال لے گئے
جب خط بھی ہوں ایسے کے وطن بیچ رہے ہوں
اور نیت کے ساتھ دل بھی جب بیمار پڑے ہوں
پھر کیسے بھلا سر کو اٹھا کر چلے کوئی
دل کیسے اس غم کو بھلا کر جیئے کوئی

مومن کی چند صفات

- ☆ توکل
- ☆ گفتگو میں صداقت
- ☆ سلام میں پہل
- ☆ انتقام میں تاخیر
- ☆ نیکی میں سبقت
- ☆ لباس میں پاکیزگی
- ☆ تکبر سے دوری
- ☆ غصے سے پرہیز
- ☆ غیبت سے اجتناب
- ☆ لوگوں سے محبت
- ☆ گھر والوں سے خوش اخلاقی

حسان عبداللہ' ایم بی بی ایس

ماں

جب تُو پیدا ہوا کتنا مجبور تھا
یہ جہاں تیری سوچوں سے بھی دُور تھا
ہاتھ پاؤں بھی تب تیرے اپنے نہ تھے
تیری آنکھوں میں دُنیا کے سپنے نہ تھے
تجھ کو آتا صرف رونا ہی تھا
دُودھ پی کے تیرا کام سونا ہی تھا
تجھ کو چلنا سکھایا ماں نے تیری
تجھ کو دل میں بسایا تھا ماں نے تیری
ماں کے سائے میں پروان چڑھنے لگا
وقت کے ساتھ قد تیرا بڑھنے لگا
دھیرے دھیرے تو کڑیل جواں ہو گیا
تجھ پہ سارا جہاں مہرباں ہو گیا
زورِ بازو پہ تُو بات کرنے لگا
خود ہی سجنے لگا خود سنورنے لگا
ایک دِن ایک لڑکی تجھے بھا گئی
بن کے دلہن ترے گھر میں وہ آ گئی
اب فرائض سے تُو دُور ہونے لگا
بیج نفرت کا خود ہی تُو بونے لگا
پھر تُو ماں باپ کو بھی بھلانے لگا
تیر باتوں کے پھر تُو چلانے لگا
بات بے بات تُو اُن سے لڑنے لگا
قاعدہ اک نیا پھر سے پڑھنے لگا
یاد کر تجھ سے ماں نے کہا ایک دن
اب ہمارا گزارہ نہیں تیرے بِن

سُن کے یہ بات تُو طیش میں آ گیا
تیرا غصہ تری عقل کو کھا گیا
جوش میں آ کے تُو نے یہ ماں سے کہا
میں تھا خاموش سب دیکھتا ہی رہا
آج کہتا ہوں پیچھا میرا چھوڑ دو
جو ہے رشتہ میرا تُم سے وہ توڑ دو
جاؤ جا کے کہیں کام دھندا کرو
لوگ مرتے ہیں تُم بھی کہیں جا مرو
بیٹھ کر آہیں بھرتی تھی ماں رات بھر
ان کی آہوں کا تجھ پر ہوا نہ اثر
ایک دن باپ تیرا چلا رُوٹھ کر
کیسے بکھری تھی پھر تیری ماں ٹوٹ کر
پھر وہ بھی بس کل کو بھلاتی رہی
زندگی اس کو ہر دن ستاتی رہی
ایک دن موت کو بھی ترس آ گیا
اُس کا رونا بھی تقدیر کو بھا گیا
اشک آنکھوں میں تھے وہ روانہ ہوئی
موت کی ایک ہچکی بہانہ ہوئی
اِک سکوں اُس کے چہرے پہ چھانے لگا
پھر تُو میت کو اُس کی سجانے لگا
مُدتیں ہو گئیں آج بوڑھا ہے تُو
ٹوٹی کھٹیا پے پڑا ابورا ہے تُو
تیرے بچے بھی اب تجھ سے ڈرتے نہیں
نفرتیں ہیں' محبت وہ کرتے نہیں

دَرد میں تُو پُکارے کے او میری ماں
تیرے دم سے ہی روشن تھے دونوں جہاں
وقت چلتا رہا' وقت رُکتا نہیں
ٹُوٹ جاتا ہے وہ جو کہ جُھکتا نہیں
بن کے عبرت کا تُو اب نشاں رہ گیا
ڈھونڈ اب زور تیرا کہاں رہ گیا
تُو بھی احکامِ رب کو بھلاتا رہا
اپنے ماں باپ کو تُو ستاتا رہا
کاٹ لے تُو وہی تُو نے بویا تھا جو
تجھ کو کیسے ملے تُو نے کھویا تھا جو
دور وہ یاد کر کے تُو رونے لگا
کل جو تُو نے کیا آج ہونے لگا
موت مانگے تجھے موت آتی نہیں
ماں کی صورت نگاہوں سے جاتی نہیں
تُو جو کھانسے تو اولاد ڈانٹے تجھے
تُو ہے ناسور' سُکھ کون بانٹے تجھے
موت آئے گی تجھ کو مگر وقت پر
بن ہی جائے گی قبر تیری وقت پر
قدر ماں باپ کی گر کوئی جان لے
اپنی جنت کو دُنیا میں پہچان لے
اور لیتا رہے وہ بڑوں کی دُعا
اُس کے دونوں جہاں' اُس کا حامی خدا
یاد رکھنا ہر اولاد اس بات کو
بھول جانا نہ رحمت کی برسات کو

سعدیہ خاف، سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنسز

تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو

تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو
گل بہاروں میں خزاں رنگ بھی ہو سکتے ہیں
لفظ شیریں ہی نہیں سنگ بھی ہو سکتے ہیں
یہ ضروری تو نہیں آگ لگائیں دشمن
اپنے یاروں کے نئے ڈھنگ بھی ہو سکتے ہیں
تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو
شیشہ پتھر سے جو ٹکرائے تو کیا ہوتا ہے
اشک جب دل میں اُتر جائے تو کیا ہوتا ہے
زندہ رہنا نظر آتا ہے بظاہر آساں
لے کے روح کوئی چلا جائے تو کیا ہوتا ہے
تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو
تمہیں توقیر ملی، چاہ کا پیمان ملا
ہمیں بدلے میں فقط شعر کا سامان ملا
اور پھر تیرے حسیں چہرے کی چاہت کے طفیل
ہمیں چہروں کو پرکھنے کا بھی عرفان ملا

تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو

شیوۂ اہل وفا' عہدِ وفا کچھ بھی نہیں

پھیر لی نظر کرم اور کہا کچھ بھی نہیں

اپنے رفقاء ہوئے حیراں تو انہیں ہنس کے کہا

بس وہ برہم ہیں ذرا اور ہوا کچھ بھی نہیں

تم سے بچھڑے تو یہ احساس ہوا ہے ہم کو

زندگی تیرے بنا اتنی بھی دشوار نہیں

اور اگر ہو بھی تو اب برملا اظہار نہیں

بیت جائے گی تیرے بعد بھی' جیسی بیتے

تیرا جانا ہے کوئی موت کا اصرار نہیں

موسموں کا شہر

ٹانگیں جیسے بوڑھے ہاتھ کی سونڈ جن پر غرارہ بھی چوڑی دار پاجامہ معلوم ہوتا ہے۔ایسی ہی چوڑی چکلی خاتون کا لطیفہ ہے کہ انہوں نے بس ڈرائیور سے بڑی لجاجت سے کہا بھیا! ذرا مجھے بس سے اتروا ''دو''

ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا تو اس کا چہرہ فرشتوں کی طرح تمتما اٹھا۔۔۔

ان فرشتوں کی طرح جنہوں نے بارِ خلافت اٹھانے سے انکار کر دیا تھا پھر خود ہی بولیں:

میری عادت ہے کہ دروازے سے الٹی اترتی ہوں مگر تمہارا الٹی کھوپڑی کا کنڈکٹر سمجھتا ہے کہ چڑھ رہی ہوں اور ہر دفعہ زبردستی اندر دھکیل دیتا ہے۔تین سٹاپ نکل گئے۔

مشتاق احمد یوسفی

محمد حفیظ اللہ' این آئی سی ای

نظم

یہ جامِ زہر اب کے مجھ کو نہیں ہے پینا
کہ عشق نے کسی کے مجھ کو سکھایا جینا

رسوا کیا ہے اُس نے مجھ کو یوں محفل میں
بس اُس کی اِس ادا نے ہلچل مچا دی دِل میں

چاہنے لگا ہوں اس کو' شام و سحر میں ہر پل
لب پر میرے ہے اب تو آتا اُسی کا نام

راتوں کو ہو کے بیدار مانگا ہے میں نے اُس کو
یہ التجا کی رب سے قسمت میں لکھ دے اُس کو

نیندیں تو اُڑ چکی تھیں' اب چین بھی گیا ہے
یادوں نے اُس کی مجھ کو بے حال کر دیا ہے

جب سے ہُوا مقدّر دیدار اُس کا مجھ کو
نہ ہی سکون کچھ ہے' نہ ہی قرار مجھ کو

خوابوں میں بھی وہی ہے یادوں میں بھی وہی ہے
مری زندگی وہی ہے' مری بندگی وہی ہے

اُس کے بنا ہے لگتا ادھورا مجھے وجود
بِنا اُس کے زندگی میں کوئی رنگ نہیں موجود

میرا حالِ دِل اُسے بھی جا کر کوئی بتائے
یہ پیاری سی نظم بھی جا کر اُسے سنائے

کوئی ہمنوا میرا بھی یہ کام کر دے
اور جا کر اُس کے پاس پیغام پہنچا دے

محبت کی اُس پہ میں کر دوں گا انتہا
بس ایک بار آ کر کہہ دے مجھے وہ ہاں

نہ کوئی گِلا ہے اُس سے' پھر نہ کوئی شکایت
فقط ایک بار کہہ دے مجھے تم سے ہے محبت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں' اگر رزق عقل اور دانشوری سے ملتا تو جانور اور بے وقوف بھوکے مر جاتے۔ انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ مقدّر سے زیادہ چاہنا ہے' وقت سے پہلے چاہنا ہے اور قناعت پسندی کی کمی ہے۔ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے لیکن ہم لوگ دنیا کے لئے محنت کرتے ہیں اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں۔

محمد عثمان اختر ' این آئی سی ای

حکایت

غرقِ مستی ہو گیا انساں کا تن
کھو دیا ہے روح نے اپنا وطن

چھا گیا افرنگ کا جادو نظام
ہو گئے مغلوب جس سے مردوزن

محوِ زلفِ یار ہونے پر فخر
ہے جوانوں کے لیے آماسِ من

اٹھ گیا ہمدردی و تعاون کا شوق
بجھ گئی قندیلِ جذباتِ امن

فتنہ پرور برقی آلے ہو گئے
عقل پہ غالب ہوا دیوانہ پن

زورِ زر پہ عزّتیں ملنے لگیں
ہو گیا سستا غریبوں کا بدن

قتل و غارت نے عدم روشن کیا
خون سے مہنگا ہوا گیہوں و گھن

پھوٹ وہ ڈالی ہے حرصِ زر نے کہ
ہیں جدا ماں باپ سے بھائی بہن

پر ہمیشہ سے نہ تھا اپنا یہ حال
میں سناتا ہوں یہ قصہء محن

امتِ مسلم جو ملت اپنی ہے
شان تھی اِک' اِس کے تھے دھرتی گگن

ذوقِ آگاہی سے اِس کے ہی تو تھا
آدمی کو آدمی ہونے کا فن

شانِ مسلم جس سے روشن تھے جہاں
اندلس و روما و ایران و یمن

شان جس سے تھے قلوبِ کافراں
زیرِ اثرِ مومنِ فولاد تن

واں تلک کوئی پہنچ سکتا نہ تھا
جس بلندی پہ تھا مومن کا ذہن

اور جس پہ اِک جہاں کو رشک تھا
کر کے شامل آریا و برہمن

اشتیاقِ عیش و عشرت نے مگر
کر دیا مسلم کو بے تاج و وطن

ہاتھ سے دین اور دنیا' سب گیا
شانِ ماضی بن گئی دل میں چبھن

جب کہ لکڑی خود صلائے عام دے
کس طرح لکڑی کو پھر نہ کھائے گھن

کھو گیا اسلامیوں سے اُن کا ذوق
طاقِ نسیاں میں گیا مسلم کا فن

ہو گیا یورپ کا کوکب پُر ضیاء
ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کا دَھن

دَھن وہی اسلاف کا علم و ہنر
دَھن کہ جس سے تھا بیاباں میں چمن

دَھن جو آدم کو سکھاتا ہے تمیز
درمیانِ آدم و زاغ و زغن

دَھن کہ جس سے ہیں منوّر یہ جہاں
پورب اور پچھّم کے سب کوہ و دمن

کیوں بھلا ملتی نہ اُن کو یہ متاع؟
بُو اسی کی، پاس جس کے ہے سمن

پا کے بُو پھر بھی ہے بھید ایسا جسے
وا نہ کر پائے گا علموں کا دَہن

دیں کی دولت جس سے ضَو پاتا ہے علم
ہے مسلمانوں کے سینے میں دفن

جس سے امت کے دَر و دیوار پہ
رحمتِ قدرت رہے سایہ فگن

جن سے لیتے ہیں جنم لعل و گُہر
ہیں وہ اُمہاتِ مسلماں کے بطن

ہے خدائے پاک سے میری دعا
''پھر سے بدلے اپنا یہ طرزِ رہن

مغربی بہروپ سے آزاد ہو
امتِ مسلم کا اقدس پیرہن

ہو طلوع پھر مسلموں کا ماہِ نو
پھر سے جاگ اٹھے امیدوں کی کرن

آئے جب کہ آزمائش کی گھڑی
ہو نہ ماتھے پہ اِس اُمّت کے شکن

دل میں دریائے عفو و درگزر
امتِ مسلم کے پھر ہو موج زن

حالی و اقبال و اکبر کے صبیح
زمزموں سے گونج اٹھے پھر سخن

پھر احادیثِ مقدس اور قرآں
کی شرح میں ہو دلِ مسلم مگن

پھر سے روشن ہو اخوت کے لیے
رنگِ بیضا کی وہ مظہر انجمن

ہے یہی نارِ جہنّم سے نجات
ہے حقیقت میں یہی راہِ عدن

امتِ مسلم کو میرا ہے پیام
کتنی ہی کیوں اِس سے نہ ہو پھر جلن
کس طرح بچ پائے گا صیّاد سے
اپنی ٹانگوں کو جو بس دیکھے ہرن

جہانِ بے مروتی

باصرہ نورٗ ایم سی ایس

اس جہانِ بے مروتی میں کوئی اپنا نہیں ہوتا
ہاں ٹھکانہ تو ہوتا ہے مگر اپنا نہیں ہوتا

اس کانٹوں بھری دنیا میں کیا کیا نہیں ہوتا
ہاں تماشائی تو ہوتے ہیں مگر کوئی غمگسار نہیں ہوتا

یہاں بشرِ مادہ ہی ہے صرف سوالوں کے لیے
کیوں اک مرد ہی جواب دہ نہیں ہوتا

عجب تماشا ہے یا رب اس محفلِ فانی میں
مجرم کوئی ہوتا ہے مگر جرم اس کا نہیں ہوتا

عجب رسمِ زمانہ ہے یا رب
مظلوم بھی عورت، ظالم کوئی اور نہیں ہوتا

ہر خواہش اولادِ نر پہ جا کر ہوتی ہے تمام
کیوں ہر باپ بیٹی کا نہیں ہوتا

بہت دور ہے اب بھی منزل مری
مگر یہ راہ دشوار ہے کہ آساں نہیں ہوتا

جُدا ساتھی

پروفیسر اصغر قادر

اس ہجوم میں تُم الگ اُس ہجوم میں میں الگ
ایک لمحے میں نظر مِلی اور ہم نہ تھے جدا جدا

یہ عمر بھر کا عہد تھا کہ ہم رہیں گے ساتھ ساتھ
مگر کچھ ایسے ہوا کہ ہم رہے جُدا جُدا

اُس عہد کا بھی پاس تھا یہ زندگی کا ساتھ تھا
کسی مقام پہ پھر ملے، تو پھر ہوئے جُدا جُدا

جو پھر قریب بھی ہوئے تو دو گھڑی کے لئے
کشیدگی تو بھی تھی اور ہم رہے جُدا جُدا

نہ پوچھ کیا نہیں کیا کہ کس کا کیا قصور تھا
کُریدنے سے کیا ملا؟ ہم اور ہوئے جُدا جُدا

وہ سلسلے کہاں گئے؟ وہ تازہ دم محبتیں؟
شبیں رہیں الگ الگ اور دِن رہے جُدا جُدا

وہ دِن بھی یاد ہیں تمہیں کہ ہم اور عشق تھے جواں
اگرچہ ہمدم نہ تھے مگر نہ تھے جُدا جُدا

ایک ہجوم میں تم بھی تھی اُس ہجوم میں میں بھی تھا
اُس ہجوم میں ساتھ ساتھ ہم چلے جُدا جُدا

نظم

ادیبہ رحمٰن، S3H

منصف الزام لگا کر
سزا سنانے میں جلدی کرتے ہیں
ذکرِ گفتگو ہو کوئی
ہم تہمت لگانے میں جلدی کرتے ہیں
باطل کا ساتھ دے کر
سچ چھپانے میں جلدی کرتے ہیں
احسان بھی کرتے ہیں
تو حق جتانے میں جلدی کرتے ہیں
مظلوم کو دیکھ کر
ہم ستانے میں جلدی کرتے ہیں
بے بس کی بے بسی کا
مزاق اُڑانے میں جلدی کرتے ہیں
جس گھر رب ہو رہتا
وہ گھر ڈھانے میں جلدی کرتے ہیں
پیسے کی بات پر
ہم خون بہانے میں جلدی کرتے ہیں
جفا کرنے والے بھی
چھوڑ جانے میں جلدی کرتے ہیں
قسمت میں جو نہ ہو عدی
اُسے اپنا بنانے میں جلدی کرتے ہیں

وجدِ شوق

اسامہ وقار بھٹی، SEECS

دل اگر سمجھے تو سیپارے بہت
آنکھ اگر دیکھے تو نظّارے بہت

آج دِل ہے روشنی کا منتظر
آج لَوٹے ہیں تھکے ہارے بہت

چاہتے ہیں رہگزر منزِل رہے
شوق پھر سے ہم کو ہے مارے بہت

صبح، حرفِ آرزو باقی نہیں
رات کو کیا پا لیئے تارے بہت؟

حادثاتِ چشم و دِل کا ذکر کیا
ہو گیئے گمراہ بے چارے بہت

ہے اُسامہ کیا مقامِ آرزو
یاد آتے ہیں مرے پیارے بہت

لگا کر آگ شہر کو یہ بادشاہ نے کہا
اُٹھا ہے دل میں تماشے کا آج شوق بہت
جُھکا کر سر کو سبھی شاہ پرست بول اُٹھے
حضور کا شوق سلامت رہے، شہر اور بہت

نسرین کوثر

انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس اشرافیہ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کاملیّت کا وہ درجہ بخشا کہ کوئی انسان آج تک اس درجے کو نہیں پہنچا' نہ پہنچے گا۔ آپ کی ذاتِ گرامی ہر اعتبار سے مکمل اور ہر پہلو سے بے مثال ہے۔ آپؐ کی زندگی کو جس پہلو سے بھی دیکھیں' درجۂ کمال کی انتہا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی کوئی ایسا انسان نظر نہیں آتا جو آپؐ کی طرح مجموعۂ کمالات ہو۔ آپؐ کے ظہور سے پہلے بھی اولیاء' صلحا' حکماء اور انبیاء نے روحانیت' حکمت' نیکی اور اچھے اخلاق کی باتیں کہیں' لیکن ایمان' اخلاق' شجاعت' حق پرستی' حکمت' انصاف' سچائی' تدبّر' صبر و تحمل' بُردباری اور ایثار کی جو جامعیّت اور کاملیّت آپؐ کی ذاتِ گرامی کو حاصل ہوئی' وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔

چونکہ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں اور آپؐ کا لایا ہُوا پیغام اللہ کا آخری پیغام ہے' جو قیامت تک آنے والے تمام زمانوں کے لئے ہے' اس لئے جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور انسان کے مادی ترقی کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود جس طرح حرص' لالچ' غرور' نسلی تفاخر اور بے انصافی کے سبب بے سکونی کا دور دورہ ہے' امن اور انصاف کے متلاشی اور سوچنے سمجھنے والے ذہنوں پر آپؐ کی تعلیمات کی اہمیت واضح تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انہیں یقین ہوتا جارہا ہے کہ انہی تعلیمات میں انسان کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

خالقِ کائنات نے آپؐ کو جو مقامِ اُولیٰ عطا فرمایا' اس کی شہادت خود قرآنِ حکیم دیتا ہے: ''بلاشبہ آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔'' (سورۃ القلم۔ آیت: 40) پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے لوگو! تمہارے لئے رسول کی ذات عمدہ نمونہ ہے۔'' (سورۃ الاحزاب۔ آیت: 61) صرف یہی نہیں' آپؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ فرمایا: ''رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔'' (سورۃ النساء۔ آیت: 80) اس ارشادِ ربانی کی موجودگی میں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسانوں میں کوئی آپؐ کے مقام کو نہیں پہنچا' اور آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ایسے رہنما ہیں کہ تمام جہانوں میں آپؐ کا نہ کوئی ثانی ہے' نہ ہوگا۔ آپؐ کے بعد رسالت و نبوت کے دروازے بند ہوگئے اور دین کے تمام لوازم کی تکمیل ہوگئی جو قیامت تک نوعِ انسانی کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

حضور پاکؐ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اُوپر جو کچھ بیان ہوا ہے' اس کی صداقت پر یقین ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ آپؐ کو رب العالمین نے جن اوصافِ حمیدہ سے نوازا' ان کا جائزہ کوئی غیر متعصب غیر مسلم بھی لے تو یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپؐ ہر اعتبار سے انسانِ کامل ہیں اور آج تک کسی دور اور کسی زمانے میں' کسی قوم کے اندر کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں ہُوا جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہوں جو آپؐ میں تھیں۔ انسانی روابط کے اعتبار سے آپؐ کی زندگی کا جس طور سے بھی جائزہ لیا جائے' آپؐ ایثار' انصاف اور سچائی کے بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ آپؐ ہر

نسٹیئن 2012ء

چھوٹے بڑے کے ساتھ خوش اخلاقی اور مروّت سے پیش آتے۔ حلم اور عفو کا یہ عالم تھا کہ جب جنگِ اُحد میں آپ کا دانت مبارک شہید ہو گیا تھا' تو صحابہ کرامؓ اس صورتِ حال پر بہت مضطرب ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ان کافروں کے حق میں بد دعا فرمایئے۔'' آپؐ کا جواب تھا کہ میں بد دعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی مخلوق کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پھر ان کافروں کے حق میں یہ دعا زبان پر جاری ہوئی: ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے' وہ جانتے نہیں ہیں۔'' شفقت' مہربانی' تحمل' بردباری اور انسانی ہمدری کی اس سے بڑی مثال بھلا کیا ہو سکتی ہے!

آپؐ کے جُود وسخا کے بارے میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے سوال کے جواب میں کبھی ''لا'' (نہیں) نہ فرمایا۔ ایک دفعہ آپؐ کے پاس نوّے ہزار درہم آئے۔ آپؐ نے بانٹنے شروع کئے' جو سامنے آیا' اسے دیتے گئے۔ یہاں تک کہ سب اُسی وقت بانٹ دیئے۔

آپؐ کی شجاعت اور بہادری بھی بے مثال تھی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب لڑائی کا معرکہ ہوتا' تو آپؐ سب سے آگے ہوتے۔ ایک رات مدینہ والوں کو کچھ خوف پیدا ہُوا اور لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے کہ دیکھیں کیا ہے۔ وہاں دیکھتے ہیں کہ آپؐ سب سے پہلے اس مقام پر موجود تھے جہاں خطرے کا امکان تھا۔ آپؐ ابوطلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور تلوار کندھے پر لٹک رہی تھی۔ آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو تسلی دینے لگے: ''مت گھبراؤ' مت گھبراؤ''۔

آپؐ حد درجہ صاحبِ مروّت تھے۔ اگر کوئی شخص غلط کام کرتا اور آپؐ کو معلوم ہوتا تو نصیحت فرماتے وقت اس کا نام نہ لیتے بلکہ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسا کام کرتے ہیں۔ آپؐ کے پاس بیٹھنے والا ہر شخص یہ خیال کرتا کہ آپؐ کی سب سے زیادہ توجہ اور نگاہِ عنایت اسی پر ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں آٹھ برس کی عمر تک آپؐ کی خدمت کرتا رہا۔ کبھی آپؐ نے ''ہوں'' نہیں کیا۔ اگر نماز کے دوران آپ کسی بچے کی رونے کی آواز سن لیتے تو نماز جلد ختم فرما دیتے تا کہ اس بچے کی تسکین و تشفی کر سکیں۔ بلّی پیاسی آتی تو آپؐ پانی کا برتن اس کی طرف جھکا دیتے اور جب تک وہ خوب پانی پی نہ لیتی' آپؐ برتن جھکائے رکھتے۔

پہلی مملکتِ اسلامیہ' جس کی حدیں آپ کی زندگی میں ہی بہت وسیع ہو گئی تھیں' کے سربراہ ہونے کے باوجود غریب ترین لوگوں میں سے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے دو دن برابر جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک مہینہ چولہے میں آگ نہ جلتی اور معہ اہل وعیال صرف سُوکھی کھجوروں پر قناعت فرماتے۔ آپؐ اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے' اپنی بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے' پھٹے پرانے کپڑے سی لیتے' اپنا اکثر کام اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اپنا کام خود کرنا چاہئے' کسی دوسرے کا اتنا محتاج بھی نہ رہو کہ مسواک کے ٹکڑے کے مطابق کسی سے مدد مانگو۔

تواضع وانکسار کا یہ عالَم تھا کہ مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی' بیٹھ جاتے۔ اپنا زانو اہلِ محفل کے زانو سے آگے نہ بڑھاتے۔ اگر صحابہ کرامؓ آپؐ کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے تو آپؐ منع فرما دیتے۔ کوئی مسکین بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی خادم بھی دعوت کرتا تو قبول فرما لیتے۔

آپؐ امین ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں خود آپؐ کی امانت کی مدح فرماتا ہے۔اس بات کے حق کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ کفارِ مکہ اگرچہ آپؐ کے بدترین دشمن تھے لیکن آپؐ کے بارے میں اُن سے کوئی پوچھتا تو وہ جواب دیتے: ''چاہے کچھ ہو محمد سچے اور امین تو ضرور ہیں۔'' کفار اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھواتے۔

دس ہجری میں آپؐ کی زندگی کا آخری حج تھا۔اس موقع پر عرفات کے میدان میں آپؐ کا تاریخی خطبہ انسان کے بنیادی حقوق کا اہم ترین منشور ہے۔ اس منشور میں آپؐ نے رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق کو باطل قرار دیا اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ سب کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی برتری حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔سب انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔آقا اور غلام کا فرق مٹانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ جو خود کھاؤ، وہی خادموں کو کھلاؤ اور جو خود پہنو، خادموں کو ویسا ہی پہناؤ اور عورتوں کے معاملات میں اللہ سے ڈرو۔فرمایا: ''تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔''

انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے سب آپؐ کی نظر میں برابر تھے۔ خاص طور پر غریبوں سے آپؐ کو محبت تھی اور ان کی مدد میں خاص اہتمام فرماتے تھے۔رات اور دن، گھر اور باہر کا آپؐ کا لباس ایک ہی ہوتا۔ زمین پر بے تکلف بیٹھ جاتے تھے۔کبھی کسی سے تُرش روئی سے پیش نہ آتے۔سب کے ساتھ کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ آپؐ کا رعب و جلال ایسا تھا کہ جو سامنے آتا مرعوب ہو جاتا، لیکن جو قریب آ کر بیٹھتا اور آپؐ کے کلامِ معجز نظام سے فیض یاب ہوتا، وہ آپؐ کی محبت دل میں لے کر جاتا۔

حضور پاکؐ مریضوں کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ مریض کے پاس ٹھہرتے، اس کو تسلی دیتے اور علاج کی طرف توجہ دلاتے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا خاص طور پر لحاظ فرماتے تھے۔بچوں سے شفقت اور پیار کرتے۔عورتوں کی امداد و اعانت کرتے اور بوڑھوں کی تعظیم اور مدد فرماتے۔آپؐ کا ارشاد ہے ''جو ہمارے بچوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہمارے زُمرے میں نہیں ہے''۔

حضورِ پاکؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایمان میں اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا، جب تک کہ میری محبت اس کے دل میں اس کے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر راسخ نہ ہو جائے (مسلم بخاری) عشق و محبت کا یہ مرتبہ ایمان کا خاصہ اور لازمہ ہے۔رسول کریمؐ کی تعلیمات کی پیروی کے بغیر محبت رسولؐ تصور میں نہیں آ سکتی۔حضور پاکؐ کے نقشِ قدم پر چلنا محبت رسولؐ کے لیے لازم ہے۔آپؐ عمدہ اخلاق سے متصف تھے۔ مردِ مومن کو بھی اپنے اندر اخلاقِ پسندیدہ پیدا کرنے چاہیں۔جو کوئی مقامِ نبویؐ سے دُور رہے اور اسوۂ حسنۂ رسولؐ کی پیروی نہ کرے، وہ اسلامی معاشرے سے خارج ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی بدامنی، پریشانی اور انسان سے انسان کی دشمنی کے سبب بے اطمینانی اور دکھ موجود ہے، نسل پرستی، قومی عصبیتیں اور سب انسانوں کے حقوق کو برابر تسلیم نہ کرنا اس کی وجہ ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رنگ و نسل کے فرق کو مٹا کر جس طرح دُنیا کو انصاف اور احترامِ آدمیت کی بنیاد پر انسانی حقوق کی حفاظت کا سبق پڑھایا، اسی کی روشنی میں سارے قیامت تک آنے والے انسانوں کی فلاح و اصلاح ہو سکتی ہے۔

روحِ قائدؒ سے مکالمہ

نسٹیئن:

محترم قائدِاعظم! قومی زندگی کے انتہائی نازک لمحوں میں آج ہم مختلف قومی معاملات پر آپ سے رہنمائی کے لئے ملتمس ہیں۔ براہِ مہربانی فرمایئے کہ ہم سنگین ترین مسائل کا شکار کیوں ہوگئے ہیں؟

قائدِاعظم:

اگر ہم خود کو پنجابی، پٹھان، بنگالی، سندھی اور بلوچی وغیرہ پہلے اور مسلمان و پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان کو سنگین ترین مسائل کا شکار ہونا ہوگا۔ اسے کوئی معمولی بات قرار دے کر ٹالئے نہیں۔ اس کی شدتوں اور امکانات سے ہمارے دشمن بخوبی آگاہ ہیں۔ میں آپ کو متنبہ کر رہا ہوں کہ بھارت کی ایجنسیاں مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنے سے نہ روک سکیں، تو اَب یہ اپنے دوسرے ہتھکنڈوں اور پُرفریب پراپیگنڈے سے پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے پر تلی ہوئی ہیں اور اس کے لئے انہوں نے پرانا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے خلاف اکسانا (1)...

نسٹیئن:

قائدِمحترم! بعض عناصر علاقائی لگاؤ کو صوبہ پرستی اور صوبائیت کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں!

قائدِاعظم:

...علاقائی لگاؤ کی اپنی اہمیت ہے، لیکن ملک کے ہر حصے کی بہتری پورے ملک کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے مقامی، علاقائی اور صوبائی مفادات کو قومی مفادات سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے (2)... اپنے صوبے سے لگاؤ اور اپنے وطن سے محبت کے درمیان امتیاز کرنا سیکھئے۔ یاد رکھئے ملک سے وابستگی کے بعد ہی صوبے، ضلعے، شہر، گاؤں اور فرد کی باری آتی ہے۔ قدرت نے ہمیں آزادی عطا کی ہے۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں، نہ کہ بلوچی، پٹھان، سندھی... یا پنجابی۔ لازم ہے کہ ہماری سوچ اور طرزِعمل وسیع تر ہو، ایک پاکستانی جیسی ہو۔ (3)

نسٹیئن:

قائدِمحترم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کہیں کہیں سوچ کا دائرہ زیادہ ہی وسیع اور طرزِعمل آزادی کی حدوں سے باہر نکلتا نظر آ رہا ہے...

قائدِاعظم:

آزادی کا مطلب بے لگامی نہیں۔ آزادی کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ مملکت کے مفادات کو نظرانداز کر کے جو چاہیں، کرتے پھریں... (4) مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ آزادی کے وسیع مواقع اور ذمہ داریوں کا احساس کرنے کے بجائے اسے من مانی کا پروانہ سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ غیرملکی تسلط سے نجات حاصل کر کے عوام اپنی تقدیر کے مالک بن گئے ہیں، انہیں آئینی ذرائع سے اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے کا اختیار ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی طبقہ یا گروہ غیرقانونی طریقے سے اپنی مرضی مسلط کرے... (5) پاکستان پر غنڈوں، بے مہار گروہوں یا ہجوم کو بادشاہی چلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ حکومتِ پاکستان کو اپنے تمام تر ذرائع بروئے کار لا کر پوری قوت سے ایسے عناصر سے

ممتاز اقبال ملک نے قائدِاعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے مرتب کیا – نسٹیئن 2010-2011

نمٹنا ہوگا۔(6)

نسٹیئن:

قائدِمحترم! بے مہار گروہوں کی شرانگیزی نے ہر پاکستانی کو درد و کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔اس مسئلے کا حل؟

قائدِاعظم:

ہمیں جن دشواریوں کا سامنا ہے اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔درد و کرب میں مبتلا ہونا فطری سی بات ہے۔خرابی ہمارے اندر ہے، ہمیں خود اسے دُور کرنا ہے۔ہماری صفوں میں نظم وضبط اور اتحاد کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔متحد ہو کر اور ہر قدم پر خود اپنا احتساب کر کے ہر مسئلے کو حل کیا اور تمام مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔(7)

نسٹیئن:

خود اپنا احتساب کس طرح کیا جاسکتا ہے، قائدِمحترم؟

قائدِاعظم:

ضمیر سے بڑھ کر انسان کا کوئی محتسب نہیں۔اس کے لئے ہر دم تیار رہیں تا کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں، تو یہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! مَیں نے خلوصِ نیت، دیانت داری، وفاداری، ذمہ داری اور تن دہی سے اپنا فرض سرانجام دیا۔(8)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! آپ نے فرمایا کہ خرابی ہمارے اندر ہے۔براہِ کرم خرابی کی نشاندہی اور اس کے خاتمے کا علاج بھی تجویز فرما دیجئے۔

قائدِاعظم:

آپ کے درمیان کچھ پانچویں کالم کے لوگ ہیں اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور اپنی کارگزاریوں کے لئے روپیہ باہر سے حاصل کر رہے ہیں۔پاک سرزمین پر ہم ان منافقوں اور ففتھ کالمسٹوں کو برداشت نہیں کریں گے، ہرگز نہیں کریں گے اور اگر یہ سب کچھ بند نہ ہُوا تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی حکومت، آپ کی اپنی حکومت، ان کو بے دردی اور سختی سے کچلنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرے گی، کیوں کہ یہ لوگ ہمارے لئے زہر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں...(9) آپ اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھیں۔موت سے نہ ڈریں۔ہمارا دین یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔مسلمان کے لئے خیر و فلاح کا اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں ہوسکتا کہ وہ حق کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔(10)

نسٹیئن:

قائدِمحترم! پاکستان کے بیٹوں نے ففتھ کالمسٹوں کو جس دلیری سے للکارا اور موت کو جس بے خوفی سے گلے لگایا ہے، اس سے آپ مطمئن تو ہوئے ہوں گے!

قائدِاعظم:

میرے تمام جذبات اُن بہادر مجاہدین کی طرف لگے ہوئے ہیں جنہوں نے کھلے دل اور بے پناہ دلیری سے اپنی پیاری زندگی تک کو اسلام اور پاکستان پر قربان کر دیا۔مَیں یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان ہمیشہ ہمیشہ اُن کا ممنون رہے گا۔اُن پیاروں کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔میرا ایمان ہے کہ اُن کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔(11)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! بھارت، افغانستان اور کچھ باوسیلہ ممالک ہمیں مغلوب کرنے کے لئے ہمارے اندرونی امن اور بیرونی سلامتی کے منافی

سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

قائدِاعظم:

ہم ان کی تمام سرگرمیوں کا مقابلہ کریں گے' مصائب جھیلیں گے۔ راستے میں ہمیں مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے گا' ہمیں نقصان بھی برداشت کرنا پڑے گا' لیکن کوئی طاقت ہمیں مغلوب نہ کر سکے گی۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور ان شاءاللہ تعالیٰ قائم رہے گا۔(12)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! یہی قوتیں ہمیں تنہا کرنے اور دباؤ ڈالنے کے لئے عالمی سطح پر بھی نت نئی مشکلات پیدا کر رہی ہیں' ایسے میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہو؟

قائدِاعظم:

جب پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اشاعتِ اسلام کی ابتداء کی' تو وہ تنہا تھے' ساری دنیا دشمن تھی اور ہر طرح کا دباؤ ڈالے ہوئے تھی' لیکن قوتِ ایمانی کے بل پر آپؐ نے کُل عالَم کو للکارا اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے انتہائی قلیل مدت میں عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔ ہم اپنے اندر ایمان کی قوت' اتحاد' نظم وضبط اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر لیں تو دنیا بھر کی مخالف قوتوں سے ڈرنے یا اُن کے پاؤں پڑنے کی بالکل ضرورت نہ ہوگی۔(13)... ہاں ہم پلہ اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے ہم کسی بھی دوسرے ملک کے ساتھ باہمی مفاہمت کے معاہدے پر تیار ہیں...(14)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! اختلافات اور تنازعات کو پُرامن طور پر طے کرنے کیلئے کیا بھارت کے ساتھ بھی کوئی معاہدہ کیا جا سکتا ہے؟

قائدِاعظم:

...بشرطیکہ حکومتِ بھارت احساسِ برتری کو ختم کر دے' پاکستان کو برابر کا سمجھے اور اصل حقائق کا سامنا کرے... باعزت معاہدہ ان ہی میں ہو سکتا ہے جو برابر کے ہوں۔ جب تک فریقین ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے سے ڈرنا نہ سیکھیں' اس وقت تک کوئی معاہدہ ٹھوس بنیاد پر طے نہیں پا سکتا۔ کمزور فریق کی جانب سے امن وصلح کی پیش کش کا مطلب کمزوری کا اعتراف اور جارحیت کو حملہ کرنے کی ترغیب دینا ہوتا ہے...(15) غیروں کے اشارے پر زندگی بسر کرنے پر آمادگی کا اظہار اور قومی مفادات کی پروا کئے بغیر دوسروں کی ہر بات مانتے چلے جانا قومی خودمختاری کا سودا کرنے کے مترادف ہے...(16)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! بعض اوقات لگتا ہے منہ زور قوتیں قومی مفادات کے منافی منصوبے اور حل ہم پر ٹھونسا چاہتی ہیں!

قائدِاعظم:

مَیں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس امکان کو تسلیم نہیں کیا کہ ہم اس ملک میں کسی قسم کے غیرملکی تسلط یا منصوبے کے تحت زندگی گزار سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی منصوبہ یا حل ہم پر ٹھونسا گیا جو ہمارے قومی مفادات کے منافی ہُوا' تو ہم پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے اور تمام تر نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہیں گے۔(17)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! مسئلہ کشمیر' دریائی پانی اور ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے ہر روز کوئی نیا اعلان' نرالا مشورہ سنائی دیتا ہے...

قائدِاعظم:

... ہم نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے' اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے کوئی بھی طاقت بھٹکا

نہیں سکتی۔ ہم نے ہر قیمت پر قومی مفادات کی نگہداشت اور حفاظت کا تہیہ کر رکھا ہے...(18)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! ہمارے معاملات میں کھُلم کُھلا غیر ملکی مداخلت پر بین الاقوامی برادری حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ تک نے آنکھیں موند رکھی ہیں...

قائدِاعظم:

اقوامِ متحدہ کا ادارہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اپنے استحکام اور دفاع کی بنیادی ذمہ داری تو ہماری ہی رہے گی...(19) ... پاکستان کو تمام خطرات اور آنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ، ہر طرح سے تیار رہنا ہوگا۔ اس دنیا میں کمزوری اور نہتا پن دوسروں کو حملہ کرنے کی دعوت دینے کا دوسرا نام ہے۔ امنِ عالم اور ملکی دفاع کی بہترین خدمت یونہی کی جاسکتی ہے کہ ہم اُن لوگوں کو جو ہمیں کمزور سمجھ کر دبا لینے یا ہم پر چھا جانے کی نیّت رکھتے ہوں، ایسا موقع ہرگز نہ دیں۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اتنے مضبوط ہو جائیں کہ کسی کو ہماری طرف بری نیّت سے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکے...(20) ہمارے اندرونی اور بیرونی حالات تسلی بخش نہیں ہیں، لیکن کیا ہم پریشانی میں مبتلا ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ پاکستان کے مرد، عورتیں، اقلیتیں اور طلبہ غرض ہر شعبۂ زندگی سے وابستہ ہر فرد یک سُو ہو کر پوری پوری دیانتداری سے اپنا اپنا کردار ادا کرے اور اس نصب العین کو کبھی نہ بھولے: کام، کام اور کام۔(21)

نسٹیئن:

آپ نے خواتین کو اپنا کردار ادا کرنے کی ہدایت کی، عصرِ حاضر میں خواتین کو کیا کرنا ہے، قائدِ محترم؟

قائدِاعظم:

قوم کی تعمیر و ترقی کے عظیم کام میں خواتین کو انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ کوئی بھی قوم اُس وقت تک عظمت کی بلندیوں کو نہیں چُھو سکتی جب تک اس کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی خدمت میں مصروف نہ ہوں...(22)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! شانہ بشانہ کے حوالے سے بعض تحفظات پائے جاتے ہیں...

قائدِاعظم:

...مَیں یہ نہیں کہتا کہ آپ مغربی طرزِ زندگی کی برائیوں کی نقالی کریں، خود اسلام نے حقوقِ نسواں کے جو معیار مقرر کئے ہیں، ہم ان کے مطابق اپنی خواتین کا رتبہ بلند کر سکتے ہیں...(23)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! آپ نے اقلیتوں کا ذکر بھی کیا، ان کے کردار کی وضاحت فرما دیجئے۔

قائدِاعظم:

ہم اقلیتوں کے جان و مال کا تحفظ کرتے رہیں گے اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک جاری رہے گا۔ حقوق و مراعات کے ساتھ وہ فرائض بھی اُن کے ذمے ہوں گے جو پاکستانی شہری ہونے کے ناتے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کو پورا کر کے وہ امورِ مملکت میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ جب تک اقلیتیں ملک کی وفادار رہیں گی، انہیں کسی قسم کا خوف یا تشویش نہیں ہونی چاہئے۔(24)

نسٹیئن:

محترم قائدِاعظم! بجا فرمایا آپ نے۔ شہنشاہِ اکبر نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا۔ غیر مسلم آج بھی اس کا حوالہ

دیتے ہیں...

قائدِاعظم:

... شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا' وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی ابتداء تیرہ سو سال پہلے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی۔ آپؐ زبانی نہیں' بلکہ عملی طور پر مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی رواداری سے پیش آئے اور ان کے مذہب اور عقائد کا احترام کیا۔ جہاں جہاں بھی مسلمانوں نے حکومت کی' وہاں کی تاریخ ان عظیم اور شائستہ اصولوں کی مظہر ہے جن پر اب بھی عمل ہونا چاہئے۔(25)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! آپ نے طلبہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنے کی ہدایت فرمائی' ذرا تفصیل مرحمت فرما دیجئے ان کے کردار کی؟

قائدِاعظم:

مَیں طالب علموں کو متنبّہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کسی کا بھی آلۂ کار بن گئے تو یہ اُن کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام پیدا کریں۔ ایمان' اتحاد' تنظیم کے اصولوں پر کاربند رہ کر آگے بڑھتے جائیں اور ایک مثال قائم کر دیں کہ پاکستان کے نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اُن کا اصل کام ہونا چاہئے: اپنی ذات سے وفا' اپنے والدین سے وفا' اپنی مملکت سے وفا' اپنے مطالعے پر پوری پوری توجہ...(26)

نسٹیئن:

... محترم قائدِاعظم! پاکستان سے وفا تو ہمارا خواب ہے' ہمارا...

قائدِاعظم:

... محض خواب دیکھنے اور تصوراتی دنیا میں بسے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا... اپنی تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ تعلیم ہماری قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا' تو نہ صرف پیچھے رہ جائیں گے' بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔...(27) دیانت' محنت' مستقل مزاجی اور کردار چار ایسے ستون ہیں جن پر کامیاب انسانی زندگی کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ آپ اپنے کردار کو مثالی بنا لیں گے تو دیگر تین صفات خود بخود آپ میں جمع ہو جائیں گی۔(28)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! کردار کیا ہے؟

قائدِاعظم:

"... کردار نام ہے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دینے کا' دیانتداری' مضبوط عقیدے اور عزتِ نفس کا..." (29)

نسٹیئن:

جنابِ محترم! حالیہ عالمی اقتصادی بحران نے پاکستان کی معیشت پر بھی ضرب لگائی ہے۔ ہمیں معاشی خوشحالی اور معاشرتی اطمینان کے لئے کیا طریقِ کار اختیار کرنا چاہئے؟

قائدِاعظم:

مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغرب کی وجہ سے ہی یہ تباہی ساری دنیا کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ مغربی نظام انسانوں کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دُور کرنے میں ناکام رہا ہے۔

... [1914ء اور 1939ء میں برپا ہونے والی] دونوں عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب اور مغربی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی مہارت اور

مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین بُحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور مالی نظام ہی اپنا لیا تو عوام کو خوشحالی مہیا کرنے کے لئے ہمیں کوئی مدد نہ ملے گی۔ اپنی تقدیر ہمیں اپنے منفرد انداز میں بنانا ہوگی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے سچّے اسلامی تصورات پر قائم ہو...(30) پاکستان کے ہر شعبے کی بنیاد عدل و انصاف اور برابری و مساوات پر ہونی چاہئے۔ دولت چند ہاتھوں میں اکٹھی نہ ہونی چاہئے۔ لوگوں کے معیارِ زندگی میں کم سے کم فرق ہو۔ مَیں ہر پاکستانی کے لئے منصفانہ اور یکساں مواقع کا حامی ہوں۔(31)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری...

قائدِاعظم:

یہاں مَیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسے ظالمانہ اور شر پسند نظام کی پیداوار ہیں جس کی بنیادیں ہمارے خون سے اُٹھائی گئی ہیں۔ عوام کا استحصال ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ لاکھوں لوگ معاشی ظلم کا شکار ہو کر دن بھر کی محنت کے باوجود ایک وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہیں؟ کیا پاکستان کا یہی مطلب ہے؟...(32) ... قیامِ پاکستان کی کٹھن جدّ وجُہد میں عوام ہی تھے، جنہوں نے رضا کارانہ طور پر میرا ساتھ دیا، خواص سب سے آخر میں آئے۔ (33)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِ اعظم! عمومی بدامنی اور انفرادی لاقانونیت پر قابو پانے اور معاشرے میں استحکام و سکون کے لئے بھی رہنمائی فرمائیے۔

قائدِاعظم:

... رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کا عظیم الشان ضابطۂ عمل موجود ہے...(34) قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مذہبی، عسکری، معاشی، معاشرتی اور اخلاق سے لے کر انسدادِ جرائم تک ہر فعل اور عمل پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے(35)... قرآنی احکام کی روشنی میں ہر فرد اور ادارہ اپنا فرض ادا کرے تو نہ صرف عمومی بدامنی اور انفرادی لاقانونیت جنم نہیں لیتی، بلکہ بطورِ مجموعی معاشرے میں بھی سکون اور استحکام رہتا ہے...(36) لاقانونیت پر قابو پانے کے لئے ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم وہ اوصاف ہیں جو آپ نے اپنے اندر پیدا کرنے ہیں۔ آپ کی اور قوم کی نجات اسی میں مضمر ہے۔(37)

نسٹیئن:

محترم قائدِ اعظم! ہم خود میں ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم کے اوصاف کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟

قائدِاعظم:

اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیا آپ کی عادات کسی ترتیب اور قاعدے کی پابند ہیں؟ کیا آپ سڑک یا راستے پر صحیح رُخ پر چلتے ہیں، کیا آپ اپنا کام دیانت اور خلوص کے ساتھ کرتے ہیں؟ کیا آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں، کیا آپ میں دوسروں کو برداشت کرنے کا مادہ ہے؟ ہوسکتا ہے یہ باتیں آپ کو چھوٹی لگیں، لیکن یہی باتیں ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم جیسے اوصاف پیدا کرنے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔(38)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! نسٹ اور نسٹیئنز کے لئے بھی چند کلماتِ شفقت عطا فرمائیے۔

قائدِاعظم:

عام مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم اقتصادی ترقی کے

لئے بے حد ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو زراعت، حیوانیات، تجارت، طب، سائنس، انجینئرنگ اور تمام مہارت طلب شعبوں میں اوّل درجے کے ماہرین پیدا کرنے پر بھرپور توجہ دینی چاہئے...ہم مسلمان دوسروں قوموں کی نسبت اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ کیا ہم صرف بی ڑی والا اور چمڑے والا ہی رہنا چاہتے ہیں یا صنعتی اور تجارتی میدان میں آگے بڑھیں گے ...(39) آپ میں سے جو لوگ عملی زندگی میں داخل ہونے والے ہیں، انہیں موقع پرستوں اور پاکستان کے دشمنوں سے خبردار رہنا ہوگا اور جن کی تعلیم ابھی جاری ہے، انہیں کسی بھی سیاسی جماعت کا آلۂ کار نہیں بننا چاہئے۔(40)

نسٹیئن:

لیکن قائدِ محترم! عملی زندگی میں داخل ہونے کے لئے اوّل درجے کے ماہر، انتہائی ہنرمند اور باصلاحیت نوجوانوں کو بھی بے پناہ مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ کچھ علاج اس کا!

قائدِ اعظم:

...پاکستان میں صنعتیں قائم کرنے سے نہ صرف بیرونی ممالک پر انحصار کم ہوگا، بلکہ پڑھے لکھے، ہنرمند اور تربیت یافتہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ عام آدمی کو بھی روزگار ملے گا۔(41)... اللہ نے پاکستان کو برسرِ زمیں اور زیرِ زمیں، بے حساب ذرائع اور لامحدود وسائل سے نوازا ہے۔ انہیں کامل دیانتداری، ذمہ داری اور عقلمندی سے پوری طرح کام میں لایا جائے تو صنعت، زراعت، تجارت اور کان کنی سمیت ہر شعبے میں ناقابلِ تصور ترقی و خوشحالی آئے گی اور روزگار کے متلاشی ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق بلا روک ٹوک روزگار ملے گا...(42) ہمیں رشوت اور بددیانتی کا سامنا ہے، انہیں آہنی ہاتھوں سے کچلنا ہوگا۔ ان کے علاوہ ناجائز فائدہ اٹھانے اور اقرباء پروری جیسی لعنتیں بھی موجود ہیں، ان کا سختی سے خاتمہ ضروری ہے...(43) مَیں سیاسی رہنماؤں پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اقرباء پروری کے لئے انتظامیہ پر دباؤ ڈالیں گے تو حق داروں کو حق نہیں مل سکے گا۔ ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے...(44) انتظامی عہدیدار اور اداروں کے سربراہ کسی سیاستدان کے دباؤ میں نہ آئیں، حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں، لیکن انتظامی منصب دار اپنے منصب پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ خدا خوفی سے کام لے کر عدل و انصاف کا مظاہرہ کریں۔ باصلاحیت اور اہل لوگوں کو حق تلفی اور محرومی سے بچائیں اور صدقِ دل سے عوام کے مسائل حل کریں...(45)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِ اعظم! سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے حوالے سے نسٹیئن میں ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے، رسولِ کریمؐ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر نسٹیئن کے صفحات آپ کے لئے بھی حاضر ہیں!

قائدِ اعظم:

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا کی عظیم ترین ہستی ہیں۔ آپؐ کی عزت و تکریم صرف کروڑوں عام مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ ساری دنیا کی تمام بڑی بڑی شخصیات بھی آپؐ کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔ مَیں ایک عاجز ترین، کم ترین، بندۂ ناچیز کہاں اس قابل ہوں کہ اتنی عظیم، عظیموں کی بھی عظیم ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا حق ادا کرسکوں۔ پیغمبرِ اسلامؐ عظیم مصلح تھے، عظیم رہنما تھے، عظیم واضعِ قانون تھے، عظیم سیاستدان تھے، عظیم حکمران تھے۔ ہم اُنؐ کی تعلیمات پر عمل کرتے رہے تو کسی بھی میدان میں ناکامی سے دوچار نہ ہوں گے...(46)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! کوئی تمنا جس کے پورا ہونے کی حسرت ہو!

قائدِ اعظم:

مَیں نے بہت دنیا دیکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شُہرت بھی بے حساب دی۔ اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کو باوقار اور سربلند دیکھوں اور میری حسرت ہے کہ جب مَروں تو میرا دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے دین اسلام سے خیانت اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ سلم) کی اُمت سے غداری نہیں کی۔ مسلمانوں کی آزادی، تنظیم، اتحاد اور مدافعت میں اپنا کردار ٹھیک ادا کیا اور میرا اللہ کہے کہ اے میرے بندے! بے شک تُو مسلمان پیدا ہُوا، بے شک تُو مسلمان مَرا...(47)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! قوم کے نام آپ کا پیغام؟

قائدِ اعظم:

اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، لیکن مَیں اپیل کرتا ہوں کہ حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا اپنا کام کئے جائیں۔ اسلام کی تاریخ بہادری اور مستقل مزاجی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں، رکاوٹوں، مصیبتوں بحرانوں کے باوجود آگے بڑھتے جائیں۔ پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی مملکت کو اتنے سنگین مسائل ومشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو ہمیں درپیش ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی مملکت نے مسائل کا مقابلہ کرنے میں اتنی پامردی، عزم اور استقلال کا مظاہرہ نہیں کیا، جتنا ہم نے۔ ہمارے دشمنوں کی خوش فہمی ہے کہ پاکستان ان مشکلات کے بھنور سے نہ نکل سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان ان مسائل کے ہجوم سے مردانہ وار اور کامران نکلے گا...(48) میرا ایمان ہے کہ تمام مشکلات، مصائب اور مسائل سے ہماری نجات کا واحد ذریعہ سنہری اصولوں والے اُس ضابطۂ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم واضعِ قانون، پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے لئے قائم کر رکھا ہے۔...(49) ... میرے عزیز پاکستانیو! قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے، آپ کے پاس لامحدود ذرائع ہیں۔ پاکستان کو ہر ممکن عمدگی اور حتی الوسع تیزی سے مضبوط اور خوشحال بنانا اب آپ کا کام ہے۔ اپنے کام کا آغاز کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ پاکستان: زندہ باد(50)

حوالہ جات

1۔ نشریاتی تقریر، ریڈیو پاکستان ڈھاکہ۔ 28 مارچ 1948ء
2۔ بلدیہ کوئٹہ کے سپاسنامے کے جواب میں۔ 15 جون 1948ء
3۔ طلبہ سے خطاب، اسلامیہ کالج پشاور۔ 12 اپریل 1948ء
4۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن میں خطاب۔ 24 مارچ 1948ء
5۔ نشریاتی تقریر، ریڈیو پاکستان ڈھاکہ۔ 28 مارچ 1948ء
6۔ فساداتِ کراچی کے بعد بیان، کراچی۔ 9 جنوری 1948ء
7۔ جلسۂ عام سے خطاب، ڈھاکہ۔ 21 مارچ 1948ء
8۔ سول افسروں سے خطاب، سبّی۔ 15 فروری 1948ء
9۔ جلسۂ عام سے خطاب، ڈھاکہ۔ 21 مارچ 1948ء
10۔ طلبہ سے خطاب، لاہور۔ 30 اکتوبر 1947ء
11۔ پیغامِ عیدالفطر۔ 17 اگست 1947ء
12۔ ریڈیو پاکستان کے افتتاح پر پیغام، کراچی۔ 15 اگست 1947ء
13۔ نشریاتی تقریر، ریڈیو پاکستان کراچی۔ 27 دسمبر 1947ء
14۔ امریکی سفیر کی تقریر کے جواب میں، کراچی۔ 26 فروری 1948ء
15۔ سوئٹزر لینڈ کے صحافی ڈی ایرک سٹریف سے انٹرویو، کراچی۔ 11 مارچ 1948ء
16۔ رائٹر کے نمائندے سے انٹرویو۔ 23 اکتوبر 1947ء
17۔ شہری استقبالیے میں خطاب، چٹاگانگ۔ 26 مارچ 1948ء

18-19۔ رائٹر کے نمائندے سے انٹرویو۔23 اکتوبر 1947ء
20۔ ایچ ایم پی ایس ''دلاور'' پر افسران اور عملے سے خطاب' کراچی۔ 23 جنوری 1948ء
21۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان کراچی۔27 دسمبر 1947ء
22-23۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب۔10 مارچ 1944ء
24۔ پریس کانفرنس سے خطاب' دہلی۔14 جولائی 1947ء
25۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریب میں وائسرائے کی تقریر کے جواب میں'
26۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن میں خطاب۔24 مارچ 1948ء
27۔ طلبہ سے خطاب' کراچی۔26 ستمبر 1947ء
28۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب۔5 فروری 1945ء
29۔ ارکانِ اسمبلی سے خطاب' دہلی۔یکم اپریل 1946ء
30۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں صدارتی خطاب' کراچی۔یکم جولائی 1948ء [کسی عوامی تقریب میں آخری خطاب]
31۔ شہری استقبالیے میں خطاب' چٹاگانگ۔26 مارچ 1948ء
32۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب' دہلی۔24 اپریل 1946ء
3 3۔ مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ کے استقبالیہ میں تقریر' کراچی۔ 19 اگست 1947ء
34۔ پیغامِ عیدالفطر۔12 نومبر 1939ء
35۔ خط بنام مسٹر گاندھی۔17 ستمبر 1944ء
36۔ صحافیوں سے گفتگو' کراچی۔2 جنوری 1948ء
37۔ بلدیہ کوئٹہ کے سپاسنامے کے جواب میں۔15 جون 1948ء
38۔ پیغامِ عیدالفطر۔ 12 نومبر 1939ء
39۔ پیغام بنام آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس' منعقدہ کراچی۔ 27 نومبر 1947ء
40۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں خطاب' لاہور۔19 مارچ 1948ء
41۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز کی تقریبِ سنگِ بنیاد میں خطاب' کراچی۔ 27 ستمبر 1947ء
42۔ پاکستان کے نئے سکّے اور کرنسی نوٹ پیش کئے جانے کی تقریب میں صدارتی خطاب' کراچی۔یکم اپریل 1948ء
43۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں صدارتی خطبہ' کراچی۔ 11 اگست 1947ء
44۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں صدارتی خطبہ' کراچی۔ 11 اگست 1947ء
45۔ سول افسروں سے غیر رسمی بات چیت' پشاور۔14 اپریل 1948ء
46۔ کراچی بار ایسوسی ایشن میں جلسۂ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں صدارتی خطاب۔25 جنوری 1948ء
47۔ اپنے معالج خصوصی کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش سے گفتگو' زیارت۔ 2 ستمبر 1948ء
48۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان لاہور۔30 اکتوبر 1947ء
49۔ دربار سے خطاب' سبّی۔14 فروری 1948ء
50۔ پاکستان کی پہلی سالگرہ پر پیغام۔14 اگست 1948ء

[یہ قوم کے نام آخری پیغام تھا— محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب ''میرا بھائی'' میں لکھا ہے کہ قائدِ اعظمؒ اپنے تمام پیغامات اور اکثر تقاریر خود ہی لکھتے تھے]

استفادہ

اس مکالمے کے جوابات اِن کتب سے لئے گئے:

1۔ سیّد قاسم محمود' مرتب' قائدِ اعظمؒ کا پیغام' پاکستان اکیڈمی' لاہور، 1967ء

2. Khurshid Ahmad Khan Yousfi, Comp, *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-i-Azam (Volumes I-IV)*, Bazm-e-Iqbal, Lahore, 1996

3. Z. H. Zaidi, Ed, *Jinnah Papers (Volume I-VII)*, Quaid-i-Azam Papers Project, Culture Division, Government of Pakistan, 2003

4. Shareef Al Mujahid and Liaquat Merchant, Comp, *Quotes from the Quaid,* Oxfored Press, Karachi, 2008

انتخاب

یہ نسٹیئن کا مستقل سلسلہ ہے۔ کوئی پُر تاثیر تحریر آپ کی نظر سے گزرے، تو اس کے معنی خیز حصے کتاب، جریدے، مضمون اور مضمون نگار کے نام کے ساتھ ہمیں بھجوایئے۔ آپ کے حوالے کے ساتھ شائع ہوں گے

نظریۂ پاکستان

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ساڑھے سات سو سال جم کر حکومت کی۔ اس کے بعد سَو برس انہیں اس سلطنت کے مختلف علاقے کھو دینے میں لگے، یہاں تک کہ حکومت سمٹ کر شاہی قلعے تک محدود ہو گئی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو جلاوطن کر دیا۔ 1857ء کے بعد 90 برس تک انگریز نے اپنی مرضی سے خوب حکومت کی۔ جب انگریز کی رخصتی کا وقت آیا تو کاروبارِ سلطنت کا مسئلہ پیچیدہ ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے لئے طرزِ حکومت کے انتخاب کا ایک بالکل نیا اور اہم تاریخی مرحلہ تھا۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر کے لئے جو وقت درکار تھا، وہ برِصغیر کو میسر نہ آیا۔ جب ترقی یافتہ ملک اس سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے، یہ برِصغیر انگریزوں کی غلامی سے دوچار ہو گیا۔

آزادی کی جدوجُہد جب کامیابی کے نزدیک پہنچی تو پتہ چلا کہ اس کی دو شکلیں ہیں۔ یہ بات اُن دنوں شاید کم لوگ جانتے تھے کہ آزادی کی جو شکل انگریزوں کی حکومت کے ختم ہونے پر متعیّن ہو گی، وہ صدیوں تک اس برِصغیر کی تاریخ پر اثر انداز رہے گی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سیاسیات کی فکرِ جدید اور نظامِ حکومت کی طرزِ جدید کے مطابق اپنی منزل کا انتخاب کریں۔ جمہوریت کی نئی اور مسلّمہ حقیقت کا گہرا اور دُور رس جائزہ ضروری ہو گیا۔ جدیّدیت کا تقاضا تھا کہ ہم بظاہر وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے ایک اقلیت بنا کر دوسرے درجے کے شہری بن جائیں۔ اس صورت کو نافذ اور مستقل کرنے کے لئے انگریز اور ہندو نے بڑی عالمانہ اور عیارانہ کوششیں کیں۔ اس کے لئے ایک طرف اتحاد، وطن اور اخوت کے گیت سنائے گئے اور دوسری جانب پاکستان کی غیر یقینی صورت اور یقینی غربت سے ڈرایا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگست 1947ء میں اس برِصغیر کی حکومت میں مسلمانوں کو کیا حصہ ملے گا؟ مگر اس فیصلے پر ایک بہت طویل مستقبل کا انحصار تھا۔ مسلمانوں کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ وہ حکومت میں حصہ نہیں لیں گے، بلکہ برِصغیر میں اپنا حصہ مانگیں گے۔ جس نے یہ مطالبہ سُنا، اُسے حیرت ہوئی بیشتر کو مسلمان اقلیت کی اس جرأت پر اور کچھ لوگوں کو مسلم قیادت کی اس فراست پر!

اسی فیصلے کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب برِصغیر میں پہلا شخص مسلمان ہُوا، اُس روز پاکستان وجود میں آ گیا تھا اور جب تک اس سرزمین پر ایک مسلمان بھی موجود ہے، انشاءاللہ تعالیٰ پاکستان قائم رہے گا۔ نظریۂ پاکستان اور مملکتِ پاکستان دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق نہیں کرتے، وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کہنے لگے کہ ایک خطۂ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ یہ نظریہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ اور ان کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت کی جگہ نقشے پر۔ سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں، مگر یہ نظریہ تو ایک بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لئے بھری جا چکی ہے۔ اس پر آنے والے لوگ حسبِ توفیق عمارتیں بناتے رہیں گے۔ کبھی چھوٹی، کبھی بڑی، کبھی بہت

نسٹیئن 2012ء

بڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نصف ہو گیا' تو اس نظریئے کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

میرِ کارواں: مختار مسعود

چار عناصر

مکّہ مکرّمہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی سیرت کی تشکیل کے لئے جو چار عناصر اختیار فرمائے' مدینہ منوّرہ میں ان ہی کی بنیادوں کو اسلامی مملکت کے قیام کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ چار عناصر ہیں:

- ''ضبط'' کے ساتھ ''تنظیم'' کو منسلک فرمایا کہ جماعتی زندگی کیلئے نظم و نسق ایک اہم ضرورت ہے
- ''تحمل'' کے ساتھ ''فراستِ مومن'' کی تلقین فرمائی اور حکمت کے رموز کو آشکار کرنے پر زور دیا
- ''لربک فاصبر'' کے ساتھ آزاد زندگی کے لئے ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور ''شجاعت'' کی تلقین فرمائی
- ''استقلال'' کے ساتھ ''قدرت و قوّت'' کے حصول پر زور دیا

اگر ہم غور کریں تو آج بھی کسی چھوٹے سے ادارے کے قیام سے لے کر بڑی سے بڑی مملکت کے قیام تک کے لئے انہی اجزائے باطنی و ظاہری کو اپنا کر ہی حصولِ مقاصد میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے' بشرطیکہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کا خوف اور حُبِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشِ نظر رہے۔ ہر قدم نیک نیتی و اخلاص کے تحت اُٹھے اور مقصد نفس پرستی نہیں' خیر خواہیِ مخلوق ہو۔ یہ ہو جائے تو مسلمان اور خاص کر اسلام کا قلعہ یعنی پاکستان جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے اجر میں عطا فرمایا' بھلا ہر اندرونی و بیرونی دشمن کی ہر تدبیر کو ناکام بنا کر کیسے نہ آگے بڑھتا جائے۔ یقین رکھئے کہ اسلام خود اپنی صداقت و حقانیت کی دلیل ہے۔ خواہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں اپنائیں یا نہ اپنائیں' ایک وقت آئے گا اور انشا اللہ تعالیٰ ضرور آئے گا کہ اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کی سربلندی پورے عالَم پر روشن ہو کر رہے گی اور یہ وہ فیضانِ نورِ نبوتؐ ہو گا' فرشتے بھی جس کے منتظر ہیں۔

نورِ مُبیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ڈاکٹر سیّد حامد حسن بلگرامی

تین وارداتیں

برٹش انڈین آرمی میں مسلمان کثیر تعداد میں تھے۔ ریٹائرڈ فوجیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو فوجی تربیت دے کر برِصغیر میں معرکۂ آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ 46-1945 کے انتخابات میں لاتعداد مسلمان فوجیوں نے چھٹیاں لے کر اپنے اپنے علاقوں میں شب و روز مسلم لیگ' دوسرے لفظوں میں قیامِ پاکستان کے لئے کام کیا۔ انڈین آرمی کے مسلمان افسر اور سپاہی مطالبۂ پاکستان کی منظوری کے رسمی اعلان سے کہیں پہلے خود کو پاکستانی فوجی قرار دینے لگے۔ وہ کھلم کھلا قائدِ اعظمؒ اور دیگر مسلمان رہنماؤں سے ملاقات کرتے اور ''ہمارے لئے کیا حکم ہے'' کا جواب مانگتے۔ یونٹوں اور بیرکوں میں مسلمان اور ہندو فوجیوں میں منافرت پھیلنے لگی۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن قرار دیتے۔ ہندو نواز وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں ''انگریز فوجی افسر خود کو مسلمان اور ہندو فوجیوں کے ممکنہ تصادم اور اس کے نتیجے میں خانہ جنگی کے آتش فشاں پر کھڑا محسوس کرتے۔ ہندوستان کی خانہ جنگی اور خلفشار سے فائدہ اٹھانے کے لئے قیامِ امن کے نام پر روس کی ہندوستان میں مداخلت اور بالآخر قبضے کا خدشہ بھی تھا۔ انگریز سول و فوجی افسر اور ان کے اہلِ خانہ جلد از جلد اس خطرے سے دُور ہونا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کی قبولیت کے علاوہ ہندوستانی سیات کا ہر راستہ خوفناک خون خرابے کی طرف جا رہا تھا۔'' (فریڈم ایٹ مڈ نائٹ: صفحہ 210)

متحدہ ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں خانہ جنگی اور اس کے بعد روس کی

مداخلت کا خطرہ اپنی جگہ' لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ فیصلہ کُن عنصر جس نے مسلمانانِ برِّصغیر کی منزل -- حصولِ پاکستان -- کو قریب تر لا کر اُن کی تقدیر بدل دی' وہ مسلمان فوجیوں کی قوت تھی جو برٹش انڈین آرمی میں ظاہر' واضح اور ثابت ہو چکی تھی۔ ہندو قیامِ پاکستان کو ہضم نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی عسکری قوت کے عنصر نے اسے بطورِ خاص پریشان کیا۔ نراسی چودھری نے برِّصغیر پر مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت اور قیامِ پاکستان میں مسلمان فوجیوں کے فیصلہ کُن کردار کے حوالے سے اپنی کتاب The Continent of Circe میں صاف صاف کہہ دیا: ''... کسی غیر ہندو قوم کو خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو' نظر انداز کر دینا ہمارے لئے تباہ کُن ہوگا۔ کیا خبر کب طاقت پکڑ کر وہ ہم پر حکومت کرنے لگے...''

اپنی کتاب Inside Story of Hinducracy میں اجیت سنگھ ڈھلوں انکشاف کرتے ہیں: ''ڈی پی دھر اور پی این ہسکر نے پیپن جا کر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب جمع کئے اور ان کے تجزیے کرتے رہے۔ پھر انڈیا آفس لائبریری لندن میں خفیہ سروسز کے کاغذات چھان پھٹک کر پاکستان کی فوجی قوت کو محدود کرنے کی تدابیر سوچیں۔ ان کی مرتب کردہ طویل رپورٹ کے مندرجہ ذیل نکات اب بھی بھارت کی ہر حکومت کی سرکاری پالیسی کا حصہ ہیں:

(1) ''حُبِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کے جسم و جان سے نکال لی جائے۔ اس کے لئے پاکستان کی جہاد مخالف قوتوں' خصوصاً مسلمانوں کے آخری نبی (حضرت محمد مصطفےٰ) کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے کو ماننے والے گروہ کو مضبوط کیا جائے' آگے بڑھایا جائے اور کام میں لایا جائے۔

(2) پاکستان کے اندر بھارت سے دوستی کی تحریک اور بھارتی ثقافت کو فروغ دینے والے پاکستانیوں کا ایک ایسا ٹولہ تیار کیا جائے جو اثر و رسوخ کا حامل ہو۔ (3) پاکستان کے اندر پاکستانیوں پر مشتمل افواج مخالف لابی قائم اور مستحکم کی جائے جو دفاعِ پاکستان کے لئے مخصوص کیے جانے والے وسائل کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ اور ہنگامہ آرائی کرتی رہے اور اپنی افواج کے خلاف نفرت پھیلا کر افواج کو شہریوں کی محبت سے محروم کر دے۔''

فیصلہ کُن لمحے: پروفیسر محمد متّور

یہ بھارتی پاکستانی!

کئی بھارتی پاکستانیوں کو بھارت اور پاکستان کے درمیان موجود رابطے کے راستے بہت محدود دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں کی ہزار میل سے زائد سرحد پر کئی واہگے کھولنا چاہتے ہیں۔ ہمارے بعض لیڈروں کے لئے یہ سرحد بھارتیوں کے بقول ایک لکیر ہے اور بس۔ اس ماحول میں یہی بات دہراتا ہوں کہ میں کہاں رہتا ہوں' بھارت میں یا پاکستان میں؟ بھارت اور پاکستان دشمنیاں لے کر پیدا ہوئے مثلاً کشمیر کا تنازعہ اور اب بھارت نے اس پر آبی جارحیت کے ذریعہ مزید تنازعے کھڑے کر دیئے ہیں اور ہر روز اس آبی جارحیت کی کوئی نئی مثال سامنے آجاتی ہے مگر ہم اس کو زیادہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم اس وقت بھارتی فلموں کی رنگینیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم مصروف ہی رہیں گے تا آنکہ (خدانخواستہ) دشمن ہماری معیشت کی رگیں بند کر دے گا۔ سخت تعجب ہے کہ ہمارے ذمہ داران بھارت کی کسی خفیہ یا کھلی جارحیت کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ جب سے امریکہ بھارت کے ساتھ کھل کر کھڑا ہوا ہے اور ہمارے ذمہ داران پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ امریکہ بھارت کو ہم پر ترجیح دیتا ہے تو ہم بھی بھارت کو پاکستان پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس کی ہر زیادتی پر چپ رہتے ہیں' خواہ یہ زندگی و موت کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔

ہندو کی مسلم دشمنی تاریخ کا حصہ ہے اور اگر ہمارے دلوں میں حضرت قائدِ اعظمؒ کی کوئی عزت باقی رہ گئی ہے تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر کوشش

کے باوجود قائدِ اعظمؒ ہندو قوم سے معمول کے تعلقات رکھنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے' صرف دشمنی باقی رہ گئی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی تاریخ اگرچہ بہت واضح ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد کی تاریخ چھپی ہوئی نہیں ہے۔ پاکستان پر کھلا حملہ کر کے اسے دولخت کرنے میں بھارت کا حصہ بہت واضح ہے۔ بھارت نے اب تک پاکستان دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اب پاکستان کے لئے بھارت کے ساتھ دوستی کی کوشش ایک ناقابلِ فہم حرکت ہے' لیکن بھارت کے اس پاکستان دشمن روّیے کے باوجود ہم اس کی فلموں اور مجروں پر مرے جا رہے ہیں۔ کیا ہم کوئی تماشائی قوم ہیں۔ ہمارے ذمہ داران کی بات تو چھوڑیئے' لگتا ہے کئی پاکستانی بھی بھارت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ یہ بھارتی پاکستانی جب بھارت کے ساتھ محبت کی پینگیں جھولتے ہیں تو وہ بھارتی فضاؤں میں لہراتی ہیں لیکن افسوس کہ ہم اس کو برداشت کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ اب یہی پاکستانی زندگی کا چلن بن چکا ہے اور ہمیں اسی انداز میں زندگی بسر کرنی ہے؟ مگر نہیں' الحمدللہ سوائے چند اوپر کے لوگوں کے ایک عام پاکستانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا' اس میں غیرت کی رمق باقی ہے۔

غیر سیاسی باتیں: عبدالقادر حسن

نقاب پوش ''دانشور''

قائدِ اعظمؒ' جی ہاں! وہ قائدِ اعظمؒ جن کا نام محمد علی جناح تھا۔ وہ محمد علی جناح جنہیں قائدِ اعظمؒ کہہ کر پُکارا گیا اور پھر یہ اُن کے نام کا حصہ بن گیا۔ حصہ کیا' نام بن گیا۔ آج بھی اُنہیں محمد علی جناح' جناح یا جناح صاحب کہہ کر پُکارا جائے تو اہلِ دل کو پسند نہیں آتا' گوارا نہیں ہوتا اور قبول نہیں ہوتا۔ پاکستان کے کروڑوں عوام اُنہیں قائدِ اعظمؒ کہتے' قائدِ اعظمؒ کے طور پر یاد رکھتے اور قائدِ اعظمؒ سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑا قائد — پاکستان کیا' جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا بھی سب سے بڑا قائد! بھارت میں سانس لینے والے بہت سے اور بھی اُن کو دل میں چھپا کر رکھتے ہیں اور بنگلہ دیش کی کشتی میں بیٹھنے والے بھی اُن کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پاکستان نہ بنتا تو بنگلہ دیش کیسے بن سکتا تھا؟ مسلم قومیّت اپنے آپ کو نہ منواتی تو ڈھاکہ کلکتہ میں مدغم ہو کر رہ جاتا۔ بنگلہ دیش کے باسی بنگالی کہہ کر نہیں' بنگلہ دیشی کہہ کر تعارف کراتے اور اپنی الگ دنیا کا پتہ بتلاتے ہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کو اِس دنیا سے رخصت ہُوئے 64 برس بیت گئے۔ بھارت میں اُن کا کوئی دن نہیں منایا جاتا اور بنگلہ دیش میں بھی اُن کے نام پر کوئی تعطیل نہیں ہوتی۔ اُن کا سرکاری سطح پر اعتراف نہیں ہوتا' اس کے باوجود وہاں موجود ہیں۔ اُن کی شخصیت توانا ہے اور اپنی طاقت کا احساس دلا رہی ہے۔ مسلم قومیّت کا وہ تصوّر دھندلا نہیں پایا جسے انہوں نے اُجاگر کیا تھا۔ پاکستان میں اُن کے اذکار سے رُوگردانی کرنے والے کم نہیں' اِن میں سے کئی دانشور بھی کہلاتے ہیں۔ قائدؒ کے نظریات کی نفی اِن کا ایمان ہے' لیکن اِنہیں علی الاعلان اِس کی جرأت نہیں ہوتی۔ انہوں نے نقاب اوڑھ لئے ہیں' چھپ کر وار کرتے ہیں۔ قائدؒ کا نام لے لے کر' اُن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اُن کی نفی کرتے ہیں۔ قائدؒ کی مخالفت کے لئے قائدؒ ہی کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی بھر جن خیالات کا رد کیا' جن تصوّرات کا دُھتکارا' اُن کو اُن ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ کُوئے دانش اور کُوئے سیاست کے زندیق ہیں۔ یہ جو بھی رنگ بدل لیں اور جو بھی نقاب پہن لیں' جس بھی حلیے میں سامنے آئیں' پاکستان اِن کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ان شا اللہ تعالیٰ اِن کی کوئی کوشش' کوئی سازش' کوئی گھات اور کوئی واردات کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

مجیب الرحمٰن شامی: قومی ڈائجسٹ' ستمبر 2011

کلمۂ حق یا سجدہ ریزی!

ہماری روشن اور منوّر اسلامی تاریخ میں لاتعداد معروف اور غیر معروف اکابرین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے منافی کاموں پر جابر سلاطین کے سامنے مسلسل کلمۂ حق کہا اور جبر، دھونس اور تحریص کے ہتھکنڈوں کے سامنے ہتھیار پھینکنے کے بجائے اپنے موقف پر ڈٹے رہے جس کے نتیجے میں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بعض صورتوں میں انہیں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے طاقتور کے سامنے کلمۂ حق ادا کیا، اس نے کلمہ حق کہنے کا حق ادا کر دیا اور سچ یہی ہے کہ ہمارے عظیم اکابرین نے اس ضمن میں کبھی کسی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ ہمارے اکابر علماء، مُلّا نہیں مجاہد تھے، ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہماری تاریخ ہمیں ''مُلّا'' کی اذان اور ''مجاہد کی اذان'' کا فرق صاف صاف بتاتی ہے۔ ہم جب ماضی میں جھانکتے ہیں تو جہاں اپنے ماضی پر فخر محسوس ہوتا ہے، وہاں دل پر اداسی کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ دل پر چھا جانے والی اداسی کا سبب یہ ہے کہ متذکرہ شہسوار میدانِ جنگ میں بیشتر صورتوں میں تنہا یا گنتی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ امام حسینؓ کے بے شمار ماننے والے خانوادۂ رسولِ مقبولؐ کو یزیدیوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھتے ہیں اور دیواروں کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح زین العابدینؒ کے بیٹے حضرت زیدؒ کے حواری ان کا ساتھ عین وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ صرف ڈھائی سو جاں نثار رہ جاتے ہیں۔ حاکمِ وقت کے اہلکار حضرت زیدؒ کی پیشانی پر تیر چلاتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے دامن پر ایک اور خونِ ناحق کا داغ لگ جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی کمر پر اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں کوڑے برسائے جاتے ہیں، مگر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھتی۔ امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں اذیتیں دی جاتی ہیں اور کوئی گھروں سے باہر نہیں نکلتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی لاش تین دن تک شہر کے چوک میں لٹکی رہتی ہے اور لوگ اس کے قریب سے آنکھ چُرا کر گزر جاتے ہیں۔ ملوکیت آنکھوں کو بے نور بنا دیتی ہے اور سروں میں سے مغز نکال لیتی ہے۔ اس نظام میں احساسِ زیاں بہت دیر بعد ہوتا ہے۔ کافی عرصے کے بعد حضرت امام حسینؓ اور ان کے خانوادہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف جاں نثاروں کا ایک گروہ سامنے آتا ہے، لیکن

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے والوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف ڈٹ جانے والے مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور طاقت کے زور پر حق کی آواز دبانے اور ان کے آلہ کار بننے والے حتیٰ کہ شہر اور اس کے مکین، کوفہ اور کوفی، رہتی دنیا تک نفرت کی علامت بن جاتے ہیں۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے نظریے کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ، اہلِ نظر کے دلوں اور دماغوں میں زندہ ہیں اور ان سے اسی طرح ہدایت اور روشنی لی جاتی ہے جس طرح وہ ہمارے درمیان زندہ موجود ہیں۔ اس کے برعکس ان مجاہدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرنے والے جابر حکمرانوں کی قبروں کے نشانات بھی موجود نہیں ہیں۔ تاریخ میں ان کا نام گالی بن چکا ہے اور ان کا مقام، مقامِ عبرت کے سوا کچھ نہیں! آج بھی یہ سوال وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ ہم نے حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنی آئندہ تاریخ کے ابواب سنہری لفظوں سے رقم کروانے ہیں یا اس ضمن میں نامۂ اعمال کی سیاہی سے ہی کام چلایا جائے گا؟

عطاء الحق قاسمی

قندیل رحمٰن

مشاعرہ آن لائن

امتحان سے فارغ ہوتے ہی ہم بندوق سے نکلی گولی کی طرح پہلی گاڑی پکڑ کر گھر پہنچے اور کمپیوٹر پر جا جھپٹے۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا انٹرنیٹ استعمال کئے ہوئے، مگر وہ ہمارے تابش بھائی ہی کیا ہوئے جو ہمیں دو منٹ خوش دیکھ لیں۔ نہایت بدذوقی سے ہم سے کی بورڈ چھیننے لگے تاکہ اپنی ای میل چیک کرسکیں۔ اسی چھینا جھپٹی میں نجانے کون سا بٹن دب گیا کہ ایک ویب سائٹ کھُل گئی جس کا نام تھا:

www.shuara.com (شعرا ڈاٹ کام)

ہم نے بھائی جان کو امی جان کے ذریعے کمرے سے باہر نکلوایا اور لگے سائٹ دیکھنے۔ تعارف میں لکھا تھا: ''یہ ویب سائٹ پاکستان کے شاعروں نے بنائی ہے تاکہ عام لوگ ان سے رابطہ کرسکیں۔ آپ ایک چیٹ روم میں اینٹر ہوکر آن لائن شاعروں سے بات کرسکتے ہیں۔'' ہم نے اینٹر کے آپشن پر کلک کیا۔ چیٹ روم میں داخل ہوتے ہی ہم نے ٹائپ کیا: السّلا مُ علیکم۔ سکرین پر وعلیکم السّلا م لکھا نظر آیا۔

ہم:

کیا آپ سب شاعر ہیں؟

احمق پھپھوندوی:

احمق مَیں ہوں اور یقین آپ کو نہیں آ رہا!

ہم:

جی... دراصل وی آئی پی لوگ عام بندے کی پہنچ میں نہیں ہوتے ناں...

انور مسعود:

ارے ہم کہاں کے وی آئی پی ٹھہرے— ہم تو عاجز سے بندے ہیں' آپ کو یقین دلانے کے لئے ایک ہلکا پھلکا' نمکین سا مشاعرہ نہ ہوجائے!

ہم:

نیکی اور پوچھ پوچھ— مَیں آپ سے حالاتِ حاضرہ کے بارے میں بھی بات کرسکوں گی کیا؟

فاخرہ بتول: ضرور ضرور' بسم اللہ کیجئے۔

ہم:

آج کی بجٹ تقریر پر کوئی تبصرہ؟

ڈاکٹر فرخ سلطان:

آمدن پر' سیلز پر' دولت پہ' جائیداد پر
ہر طرف خنجر نظر آیا ہے لٹکا ٹیکس کا
سانس تک لینے کی نوبت آ گئی ہے ٹیکس کی
پھر بھی ظالم' بھر نہیں پایا ہے مٹکا ٹیکس کا

ہم:

یہ سارا معاملہ آپ پر کیسے اثر انداز ہُوا؟

انور مسعود:

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلے سے بڑھ کے ہے
ہر ضربِ کربناک پہ مَیں تِلملا اُٹھا

پانی کا' سوئی گیس کا' بجلی کا' فون کا
بِل اتنے مل گئے ہیں کہ مَیں بلبِلا اُٹھا

ہم:

نئی کابینہ میں کیا کوئی شاعر بھی وزیر بنے ہیں؟

سعید آغا:

یار جو بھی مل گیا اُس پر وزارت لاد دی
جانے کیا تعبیر نکلے' ذہن میں خنّاس ہے
رات مَیں نے خواب دیکھا ہے وِفاقی قِسم کا
میں وزیرِ باجرہ ہوں' تُو وزیرِ گھاس ہے

ہم:

بہت شکریہ! ہمیں وزیرِ گھاس بنانے کا' گوخوابوں کے دیس کی وزیر .....لیکن یہ کیا کہ وزارتیں بقول آپ کے یاروں میں بٹ گئیں اور تعلیم یافتہ افراد' یعنی شعراء کو نو لفٹ!!

پاپولر میرٹھی:

اس مرتبہ بھی آئے ہیں نمبر تیرے تو کم
رُسوائیوں کا کیا مِری دفتر بنے گا تُو؟
بیٹے کے سر پہ دے کے چپَت باپ نے کہا
پھر فیل ہو گیا ہے! منسٹر بنے گا تُو؟

ہم:

جی قدوائی صاحب! آپ عینی شاہد ہیں' تو ضرور بتایئے کہ چپَت کھانے کے بعد بیٹے نے کیا کہا والد صاحب سے؟

ناظر قدوائی:

قوم کے درد میں مَیں قوم کا لیڈر ہوتا
یا تمنا ہے کہ چھوٹا سا منسٹر ہوتا
اور یہ بھی جو نہ ہوتا تو کم از کم والد
ایک اچھی سی منسٹر کا ہی شوہر ہوتا

ہم:

علامہ پاکٹ مار نے ہمارے کالج میں اسی موضوع پر چند اشعار سنائے تھے اور اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی تھی اُن کو۔ کیا وہ شعر...

علامہ پاکٹ مار:

ایک بنگلہ ہو ایک پاکٹ ہو
پَل کی پَل میں امیر ہوجاؤں
دستخط تو مجھے بھی آتا ہے
کاش! مَیں بھی وزیر ہو جاؤں

ہم:

بطور وزیرِ گھاس سوچ رہی ہوں کہ ہماری زِراعت بھی گھاٹے کا سودا بن گئی - کیا وزیرِ باجرہ اس کی وجہ بتائیں گے؟

سعید آغا:

تشویش و اضطراب سے کہتا تھا اِک کساں
امریکی سُنڈیاں مِرے کھیتوں میں آ گئیں
مَیں نے کہا میاں تجھے کھیتوں کی فکر ہے
کم بخت سُنڈیاں تو ترا مُلک کھا گئیں

ہم:

شاید یہ فیشن بھی سُنڈیوں کے ساتھ آیا ہے کہ صرف خواتین ہی نہیں' حضرات نے بھی عجیب حُلیے بنا لئے ہیں۔ آپ میں سے بزرگ حضرات انہیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

اطہر شیر کوٹی:

فیشن ایبل لڑکیاں جو بال کٹوانے لگیں
اُن کی ضد میں ڈسکو دیوانوں نے رکھ لیں چوٹیاں
اُن کو اطہر شیر کوٹی کس طرح سمجھائے گا
جن کو لگتی ہوں بڑے بوڑھوں کی گالاں کھوٹیاں

ہم:

فیشن زدہ نوجوان غلَط مَلَط انگریزی بول کر اپنا اور اپنے اِدارے کا مذاق اُڑوا رہے ہیں، چلئے اس حوالے سے تو کچھ کہہ دیجئے اُن سے!

مرزا محمود سرحدی:

ہم غریبوں سے آپ کیوں صاحب
مفت کے جھگڑے مول لیتے ہیں
آپ کی طرح سے تو انگریزی
خانسامے بھی بول لیتے ہیں

ہم:

شاید ہمارے کچھ لوگ غلَط فہمی کا شکار ہیں!

عبدالباری آسی:

غلَط فہمی کا فیشن سے اِزالہ ہو نہیں سکتا
کوئی گورا کسی کالے کا سالا ہو نہیں سکتا
جنابِ شیخ بھی ہنس ہنس کے بولے چپکے چپکے سے
پُڈنگ اچھا ہے، حلوہ اس سے اعلیٰ ہو نہیں سکتا

ہم:

کھوکھلے علم کا رعب جمانے والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے جو تم نے ایم اے تو
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

ہم:

ڈاکٹر صاحب! بڑی کھری نصیحت کی ہے آپ نے کھوکھلا پارٹی کو۔ سنا ہے گزشتہ دنوں آپ نے اپنے صاحبزادے کو بھی بڑی کلاسک نصیحت کی تھی ۔ بھلا کیا تھی وہ نصیحت!

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

تری شادی کی باتیں چل رہی ہیں آج کل بیٹا
سو تیرا صاف ستھرا ہر گھڑی رہنا ضروری ہے
مِرا مطلب، مہینوں تک نہانے کی نہ ہو فرصت
تو پھر ہفتے کے ہفتے ہاتھ منہ دھونا ضروری ہے

ہم

بجلی کے بحران نے آپ لوگوں کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا ہے؟

عنایت علی خان: یہ آپ نے کس دُکھتی رگ پر ہاتھ بلکہ پاؤں رکھ دیا...

دل کا کنول نہ ہو سکا روشن کسی طرح
آیا وہ گُل عِذار تو بجلی چلی گئی
''عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن''
باقی تھے پونے چار تو بجلی چلی گئی

اچانک کمپیوٹر کی سکرین تاریک ہوگئی ـــ حسبِ معمول بجلی جا چکی تھی اور ہم چیخ اٹھے: یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

فرح اسلم

پہچان

''مَیں نہیں رہ سکتا اب اس مُلک میں۔کیا دیا ہے اس نے مجھے' فرسٹریشن' مایوسی! بس میں نے کہہ دیا ہے آپ سے' مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میرا رزلٹ نکل آیا ہے' اس لئے اب آپ میرا ویزا لگوا دیں۔'' یہ سب باتیں احمد اپنے والد سے کہہ رہا تھا۔اس پر والد نے سمجھایا:'' دیکھو بیٹا! یہاں سب کچھ ہے' عزت کی دال روٹی مل رہی ہے۔اپنی زمین ہے' اپنے لوگ ہیں' باہر ملکوں میں اپنا کچھ بھی تو نہیں۔آزادی کی قدر کرنا سیکھو!''

''عزت؟ سب پیسے کو سلام کرتے ہیں۔ یہاں تو کسی کی جان بھی محفوظ نہیں۔راہ چلتے کو گولی مار دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود جاب نہیں ملتا۔اور اتنی گرد ہے کہ بندہ کھل کر سانس نہیں لے سکتا' گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر' سڑکوں پر کیچڑ اور گندے نالوں میں ننگ دھڑنگ بچے۔اُف توبہ۔نہیں بابا نہیں' اب مزید اس گندی فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔باہر کے ملکوں میں دیکھیں' کوئی گرد نہیں' آزادی سے انصاف ملتا ہے' خوبصورت ملکوں کے خوبصورت لوگ۔'' احمد کسی طور مان ہی نہیں رہا تھا اور پھر بابا کو بھی ہار ماننا پڑی کہ اس وقت احمد کے سر پر باہر جانے کا بھُوت سوار تھا۔انہوں نے تھوڑی بہت زمین بیچی اور ٹکٹ اور ویزے کا انتظام کیا۔احمد کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔امریکہ جیسے ملک میں احمد نے گویا جنت پالی۔لائق تو تھا ہی' اچھا جاب بھی مل گیا۔

پہلے پہل تو احمد نے گھر والوں کو پیسے بھیجے۔یہ بھی لکھا کہ آپ سب کو میں یہاں بلالوں گا' لیکن پھر سب کچھ بھُول کر وہیں کا ہو رہا۔وہیں ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی جو سوچ میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔

''ڈیڈی ہمارا ملک کہاں ہے؟'' ایک روز اپنی بارہ سالہ بیٹی ماریہ کے منہ سے یہ سوال سن کر احمد ٹھٹک گیا۔

''کیوں بیٹا تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔''

ڈیڈی! وہ میری کلاس فیلو کرینا ہے ناں' وہ کہہ رہی تھی کہ امریکہ تمہارا ملک نہیں ہے۔تم اپنے ملک میں کیوں نہیں رہتی؟''

''نہیں بیٹا یہی ہمارا ملک ہے' تم یہاں پیدا ہوئی' تمہارا بھائی اور بہن بھی۔یہی ہمارا ملک ہے۔'' احمد نے گویا اپنی طرف سے اسے سمجھا دیا۔

جُوں جُوں وقت گزرتا گیا' ماریہ کے سوالات میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا:''ڈیڈی یہ پاکستان کہاں ہے؟ میری ایک نئی دوست بنی ہے' عائشہ۔وہ کہتی ہے ہمارا ملک پاکستان ہے۔ڈیڈی وہ ہر سال پاکستان جاتی ہے۔کہتی ہے کہ پاکستان بہت خوبصورت ہے۔''

''احمد جس بات سے ڈرتا تھا' جس بات کی اس نے اپنے بچوں کو ہوا بھی نہ لگنے دی تھی' آج اس کی بیٹی اُسی پاکستان کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔وہ ماریہ کو بتانے لگا:''بیٹی یہ سچ ہے کہ میں پاکستان میں پیدا ہوا۔ تمہارے دادا' چچا سب وہیں رہتے ہیں' لیکن تم وہاں نہیں رہ سکو گی۔تم وہاں اپنی پسند کی جینز' ٹی شرٹ نہیں پہن سکتی۔اب امریکہ ہی ہمارا ملک ہے۔میں پاکستان کو بھُول چکا ہوں' اس لئے تم بھی اس کے متعلق مت سوچو۔'' لیکن ماریہ کا اضطراب بڑھتا گیا اور آج تو وہ بہت ڈسٹرب

نسٹیئن 2010-2011

ہوئی جب اس کی ایک کلاس فیلو نے اسے کہا: ''تم جپسی ہو' تمہارا کوئی گھر نہیں اور تم امریکہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے غریب ملکوں کے لوگ ہو۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں اور تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ہماری قومی تقاریب میں شرکت کرو۔''

آج پھر احمد سے اُس کی بیٹی پوچھ رہی تھی: ''ڈیڈی امریکہ میں ہماری حیثیت کیا ہے؟'' آج اس کی ماما بھی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

''ربش! ماریہ تم یہ کیسی باتیں سوچتی رہتی ہو۔ ہم امریکن ہیں اور ہماری حیثیت بھی ایک امریکن کی سی ہے۔''

''نہیں ماما' نہیں نا۔ ہم امریکن نہیں ہیں' ہم جپسی ہیں' یہ ہمارا مستقل گھر نہیں' ماما! جینز' ٹی شرٹ پہن لینے سے کیا ہم امریکن ہو گئے؟''

''میرے خیال میں یہ عائشہ تمہیں الٹی سیدھی باتیں بتاتی رہتی ہے۔ بس تم اس سے دوستی ختم کر دو اور خبردار جو یہ اُلٹی سیدھی باتیں ذہن میں بٹھائیں۔'' ماما نے اسے ڈانٹا۔

ماریہ کیا کرتی۔ عائشہ سے تو اس کی پکی دوستی تھی۔ وہ اس سے کیسے دوستی ختم کرتی۔ وہ ویسے بھی اسے پاکستان کے بارے میں بتاتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ اب وہ کالج میں تھی۔ ماما کے منع کرنے کے باوجود یہاں بھی اس کا زیادہ فارغ وقت عائشہ کے ساتھ گزرتا۔ عائشہ جب بھی موڈ میں ہوتی اسے پاکستان کے بارے میں بتاتی۔ ماریہ بہت دیر تک حیرانی سے اس کی باتیں سنتی۔ وہ ایک عجیب اُلجھن میں تھی۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ پاکستان اچھا نہیں ہے اور عائشہ اسے پاکستان کے متعلق اچھی باتیں بتاتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جا کر خود دیکھے لیکن کیسے؟ آخر اس کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ ان کا سٹڈی ٹرپ پاکستان جا رہا تھا۔ اس نے ڈیڈی سے بات کی۔

''واٹ! کیا کہا؟ تمہارا ٹرپ جا رہا ہے پاکستان؟ لیکن وہاں کیا ہے؟''

''ڈیڈی ٹیچر کا کہنا ہے کہ پاکستان میں بہت ورائٹی ہے۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو بھی پاکستان میں ہے۔ اس کے علاوہ...''

''مجھے پتہ ہے' لیکن وہاں یہ سب کچھ دیکھ کر تم لوگ کرو گے کیا بھلا؟''

''ڈیڈی ہمیں ریسرچ کرنا ہے وہاں...''

وہ بھی آخر ضدی باپ کی بیٹی تھی۔ اجازت لے کر ہی ٹلی' ''اور ہاں ڈیڈی مجھے دادا جان کا ایڈریس بھی دے دیں۔''

سارا سفر اس نے بڑے اشتیاق سے گزارا۔ ائر پورٹ سے اُتر کر وہ سب ہوٹل چلے گئے۔ وہ راستے میں گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ کتنا مختلف ہے یہاں سب کچھ' وہ سوچ رہی تھی۔ اس کی بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی' جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

ہوٹل میں ایک دن آرام کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے دودھیال جانے کا فیصلہ کیا۔ عائشہ کے ساتھ وہ ڈھونڈتے ہوئے ''پپی ہاؤس'' پہنچ ہی گئی۔ جب اس نے سب کو اپنے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ دادا' دادی' چچا' چچی سب نے باری باری اسے چوما' سینے سے لگایا۔ اسے سب بہت اچھا لگا۔ وہ حیران تھی اور خوش بھی۔ سب نے اسے ہوٹل سے یہاں شفٹ ہونے کو کہا اور پھر اس نے اپنی کالج فیلوز اور کزن کے ساتھ سارا ملک دیکھ ڈالا۔ پاکستان کو اس نے عائشہ کی بتائی باتوں سے بڑھ کر خوبصورت پایا۔ اس کی روانگی کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ اس کا واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ایک مہینہ گزر گیا۔

اس دن وہ اکیلی بیٹھی تھی کہ دادا جان اس کے کمرے میں آ گئے۔ ''کیا کر رہی ہے ہماری بیٹی؟'' انہوں نے پیار سے اسے قریب کیا۔

''بس جانے کا سوچ رہی تھی۔ دادجان! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ہمیشہ کے لئے یہاں آ جائیں؟ ڈیڈی آخر پاکستان سے اتنا خائف کیوں ہیں؟'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔

''بیٹا! بات دراصل یہ ہے کہ وہ ناسمجھ ہے۔ اس نے ایک آزاد ملک میں آنکھ کھولی۔ اسے آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانی نہیں دینا پڑی۔ بلکہ اُسے آنکھ کھولتے ہی آزاد ملک ملا۔ کاش وہ سمجھ سکتا کہ اس کے بزرگوں نے کتنی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا۔ اپنے خون سے اس مٹی کی آبیاری کی۔ بیٹا! جس پرندے نے پنجرے کی قید نہ کاٹی ہو وہ آزادی کی اُڑان کی حقیقت کو کیا سمجھے گا۔ اس کو اس ملک میں کچھ نظر نہیں آتا جس کو بنانے کے لئے اس کے بزرگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اپنا سب کچھ آنے والی نسلوں کے لئے قربان کر دیا' لیکن آنے والی نسلوں نے بزرگوں کی سینچی ہوئی زمین کی قدر نہ کی۔ اگر وہ ذرا توجہ کریں تو ہر طرف ہریالی پھیلا سکتے ہیں۔ ماں جو بچے کی ہر تکلیف میں اس کا ساتھ دیتی ہے' کیا ماں کا کوئی حق نہیں بچے پر؟ اتنا حق بھی نہیں کہ بچہ اس کی عزت ہی کر سکے اور احمد بیٹا شاید یہ بات نہیں جانتا کہ اپنی ماں میں چاہے کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں' وہ اپنی ہی ہوتی ہے' لیکن احمد بیٹے نے ماں کی قدر نہ کی۔ اسے واپس پاکستان آنا ہوگا' کہ ماں کی محبت کبھی نہ کبھی اسے ضرور تڑپائے گی۔''

ماریہ نے دیکھا کہ دادا جان کانپ رہے تھے اور ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ کیا اور یہ خط لکھ کر والد کو بھیج دیا۔

پیارے بابا

السلامُ علیکم!

آپ حیران مت ہوں کہ میں نے آج آپ کو ڈیڈی لکھ کر کیوں مخاطب نہ کیا۔ بابا یہی ہماری زبان ہے۔ آپ کی بتائی ہوئی باتوں کے برعکس پاکستان مجھے بہت اچھا لگا' یہاں سب کچھ ہے۔ میں نے تقریباً پورے ملک کی سیر کی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی شرم نہیں کہ پاکستان پوری دنیا سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں کے تاریخی مقامات کی شان' پہاڑی علاقہ جات کا بے مثال حُسن' چار سُو پھیلے ہرے بھرے کھیت' کھیتوں میں کام کرتے لوگ' ڈوبتے سورج کے بعد پھیلنے والی سرخی

یہ ارضِ پاک ہماری' نشانِ عزّت ہے
شناخت ہے یہ ہماری حِصارِ وحدت کی

شبِ مبارکۂ قدر میں مِلی ہے ہمیں
بہ فیضِ ختمِ رسالت ﷺ خدا کی رحمت ہے

یہ میرا مُلک' مِری سرزمیں' میرا وطن
مِرے خدا کا کرم ہے' اُسی کی قدرت ہے

مہِ صیام بھی ہے' قدر والی رات بھی ہے
قیامِ ارضِ وطن رحمتوں کی کثرت ہے

یہ مُلک' مُلکِ خداداد ہے خُدا کی قسم!
وجود اِس کا بہر طور اِک عنایت ہے

جو اِس کو خواب سمجھتے تھے' اُن کو جتلا دو!
کہ آج اِس کا قیام و بقا حقیقت ہے

مزاج اِس کے جوانوں کا خوب پہچانو!
کہ ہر جوان کو اِس سرزمیں سے اُلفت ہے

دُعا کرو کہ خدا ہم کو سرفراز کرے
اَدائے فرض کی تاریخ ہم پہ ناز کرے!

—سید محمود احمد

میں ملا ہوا' کچے گھروں سے اُٹھنے والا دھواں' کنوؤں سے پانی بھرتی معصوم لڑکیاں اور پیارے پیارے کھیل کھیلتے بچے! بابا سب کچھ بہت اچھا ہے' سب سے بڑھ کر۔ بابا آپ کو یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آیا؟ آپ کہتے ہیں پاکستان نے آپ کو کیا دیا؟ میں پوچھتی ہوں کہ آپ نے پاکستان کو کیا دیا؟ اس ملک کو جہاں آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی' جس ملک نے آپ کو تحفظ دیا' آپ نے اس ملک کے تحفظ کے لئے کیا کیا؟ میں مانتی ہوں آپ کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہوگی' لیکن آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ آئندہ یہ زیادتی کسی کے ساتھ نہ ہو۔ آپ پڑھے لکھے تھے' باشعور تھے' پھر آپ نے اپنی اعلیٰ تعلیم کو اپنے ملک میں استعمال کیوں نہ کیا۔ آپ کہتے ہیں وہاں گرد ہے' کرپشن ہے' سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں' لیکن آپ نے یہ سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ آپ تو باشعور تھے' اپنے ملک کے مسائل سمجھتے ہوئے بھی آپ نے انہیں حل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ راہِ فرار کیوں اختیار کی؟ مجھے یہ سب باتیں پاکستان نے سکھائیں' آپ کے اور میرے وطن پاکستان نے۔ آپ کہتے ہیں ہم امریکن ہیں۔ بابا! وہاں ہمیں کوئی پوچھتا بھی نہیں' یہاں سب بہت عزت کرتے ہیں۔ وہاں تو آج تک مجھے اپنے پڑوس کا ہی پتہ نہیں چلا' یہاں پورا محلّہ ایک فیملی کی طرح رہتا ہے۔ سب مجھ سے ملنے آئے' پیار کیا۔ بابا! یہاں مجھے کوئی نہیں کہتا کہ تم امریکہ میں پیدا ہوئی ہو' وہیں رہو۔ سب کہتے ہیں ہماری بیٹی آئی ہے اور پوچھتے ہیں کہ اب یہیں رہیں گی ناں؟ بابا کیا امریکہ میں یہ ساری محبتیں ہیں؟ آج آپ خود سے پوچھیں کیا آپ امریکن ہیں؟ بابا ہمارا ملک بہت اچھا ہے' مجھے یہاں کی گندی گلیاں امریکہ کی صاف ستھری سڑکوں سے اچھی لگی ہیں۔ مجھے یہاں کے میلے کچیلے بچے بُرے نہیں لگتے۔ امریکہ جیسے ٹپ ٹاپ ملک میں لوگ اس محبت سے نا آشنا ہیں جو یہاں کے لوگوں کے خمیر میں رچی بسی ہے۔ بابا! آپ ضرور سوچیں۔ اگر آپ امریکہ میں مجھے یہ ساری خوبیاں ڈھونڈ دیں' تو میں ضرور واپس آجاؤں گی۔ اللہ حافظ! آپ کی بیٹی: ماریہ احمد

احمد بلند آواز سے خط پڑھتا جا رہا تھا۔ خط ختم کر کے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ ماریہ کے خط نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں آ کر اس نے کیا پایا؟ اٹھارہ گھنٹے روزانہ جاب نے اس سے وہ آرام اور سکون چھین لیا جو پاکستان میں اسے میسر تھا۔ اسے بیڈ پر وہ نیند نہیں آتی جو وہاں خالی چارپائی پر آتی تھی اور یہاں کے فاسٹ فوڈز میں وہ مزا کہاں جو ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ کے بنے گرم پراٹھے اور چُوری میں تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جتنی عزت اور اپنائیت پاکستان میں تھی' وہ یہاں کہاں۔ پچھلے ہی ہفتے اس کی کمپنی کے مالک نے اپنی پراڈکٹ کے نمونے اس کے زیرِ نگرانی بھجوانے سے محض اس لئے انکار کر دیا کہ احمد غیر ملکی تھا۔ اپنا گھر بار' سب کچھ جس ملک کے لئے چھوڑا' وہ ملک اسے وہاں کے ایک عام شہری کی حیثیت دینے سے انکاری تھا۔ اب اسے وہ سب باتیں سمجھ آ رہی تھیں جو ابّا نے آنے سے پہلے کہیں' لیکن کیا اتنے برسوں بعد وہ ملک اور وہاں کے لوگ اسے قبول کر لیں گے؟ اس نے سوچا' تو بابا کی آواز اس کے دماغ میں گونجنے لگی: ''اپنا وطن ماں کی آغوش کی طرح ہے۔ جب تم بہت تھک جاؤ تو ماں کی آغوش میں پناہ لے لینا۔''

احمد اب واقعی تھک چکا تھا۔ اپنا باقی وقت اپنے وطن اور اپنے لوگوں میں گزارنا چاہتا تھا اور اب ہی تو اسے یہ احساس ہوا تھا کہ اپنا ملک اپنا ہوتا ہے' جہاں اس کے ماں باپ اور سب اپنے اس کے منتظر تھے۔

پاکستان ہی اس کی اصل پہچان تھا!